اصول فہم قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

ترتیب

عبداللہ غلام احمد

ادارہ تدبر قرآن و حدیث لاہور

جملہ حقوق حق مرتب محفوظ ہیں

نام کتاب	اصول فہم قرآن
مصنف	مولانا امین احسن اصلاحی
مرتب	عبداللہ غلام احمد
اشاعت	باراول ستمبر 1999ء
کمپوزنگ	کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد اکرام الحق
ناشر	ادارہ تدبر قرآن وحدیث لاہور
ہدیہ	

ملنے کا پتہ

۱-ادارہ تدبر قرآن وحدیث رحمان سٹریٹ مسلم روڈ سمن آباد لاہور

۲-دارالتذکیر ،رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فہرست

دیباچہ	5
فہم قرآن کے لیے چند بنیادی اصول	7
۱- قرآن مجید کی دعوت عقل وفطرت پر مبنی ہے	8
۲- قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے	16
۳- قرآن حق وباطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی ہے	23
۴- قرآن مجید قریش کی ٹکسالی عربی زبان میں نازل ہوا	29
۵- قرآن قطعی الدلالہ ہے	34
نسخ اور اس کی حکمت	45
حکمت قرآن کے فہم کے لیے اساس	54

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

صاحب تفسیر تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے ۱۹۸۰ء میں ادارہ تدبر قرآن و حدیث قائم کیا اور اس میں سب سے پہلے قرآن اور حدیث کے مطالعہ کے اصولوں پر متعدد لیکچر دیے۔ اس کے بعد ان کی روشنی میں قرآن مجید، موطا امام مالکؒ اور صحیح بخاری شریف کی تعلیم شروع کی۔ حدیث پر مولانا کے اصولی لیکچروں کا مجموعہ "مبادی تدبر حدیث" کے نام سے بہت پہلے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن مولانا نے جو ہدایات فہم قرآن کی راہ کھولنے کے لیے دی تھیں وہ شائع نہ ہو سکیں، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مولانا نے تفسیر قرآن کے بارے میں بہت سی بنیادی چیزیں 'مبادی تدبر قرآن' کے نام سے شائع ہونے والی کتاب میں، نیز تفسیر تدبر قرآن کے مقدمہ میں بیان کر دی تھیں۔ حال ہی میں مضامین کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ مولانا کے مذکورہ لیکچرز اپنی جگہ بے حد جامع اور مدلل ہیں، یہ مجمل بھی ہیں جن کو پڑھ کر مضمون کو ذہنی گرفت میں لانا ایک قاری کے لیے بے حد آسان ہے۔ مزید براں یہ سابقہ تحریروں پر بعض اہم اضافوں کے حامل بھی ہیں، لہٰذا ان سے استفادہ بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ ان لیکچرز کو 'اصول فہم قرآن' کے نام سے اس رسالہ میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

ان مضامین میں قرآن مجید کے بارے میں بعض ایسی اساسی معلومات ملتی ہیں جن سے واقف ہوئے بغیر قرآن کا ایک طالب علم فہم قرآن میں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ مثلاً قرآن میں استدلال کی نوعیت کیا ہے، قرآن کے آفاقی و انفسی دلائل کا مفہوم کیا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سابق انبیاء کی طرح معجزات کیوں نہیں دیے

گئے تھے؟ عقل کو دین میں کیا مقام دیا گیا ہے؟ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب کیا ہے؟ اس کی خصوصیات کون سی ہیں اور ان کی حکمت کیا ہے؟ قرآن اور حدیث کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ کیا حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے؟ کیا وحی متلو اور وحی غیر متلو ہم پلہ ہیں، قراتوں کے اختلاف کی ماہیت کیا ہے؟ قرآن میں منسوخ آیات ہیں یا نہیں؟ قرآنی فلسفہ کے بنیادی ستون کیا ہیں اور ان کے دلائل کی نوعیت کیا ہے؟ وغیرہ- مولاناؒ کے اپنے الفاظ میں جس طرح دوسرے علوم میں بعض بنیادی حقائق بطور اصول موضوعہ مان لیے جاتے ہیں اور ان پر عمل کی بنیاد رکھی جاتی ہے اسی طرح قرآن مجید کو ماننے اور سمجھنے کے لیے بھی کچھ اصول موضوعہ ہیں جو قرآن کے ہر طالب علم پر بالکل واضح ہونے چاہئیں- اگر ان کے بارے میں وہ متردد ہو تو فہم قرآن کی راہ اپنے لیے مسدود کرلے گا- یہی اصول موضوعہ اس رسالے میں بیان ہوئے ہیں-

یہ لیکچرز اس دور کے ہیں جب مولانا مرحوم تصنیف کے کام میں دقت محسوس کرتے تھے- چنانچہ لیکچرز ٹیپ کر لیے گئے اور پھر ٹیپ سے اتار کر ان کو مرتب کر لیا گیا- اس طرح کے کام میں الفاظ و کلمات میں معمولی تغیر و تبدل یا حک و اضافہ ضروری ہوتا ہے- یہ کام ادارہ کے رفیق جناب عبداللہ غلام احمد نے سر انجام دیا اور مولاناؒ کے دیکھ لینے کے بعد ان مضامین کی اشاعت کی نوبت آئی-

رسالہ کی اہمیت کے پیش نظر قرآن کے طالب علموں کو اسے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیے- ان شاء اللہ وہ اس کو بے حد مفید اور سہل پائیں گے اور یہ قرآن فہمی کی راہ میں حائل بہت سی مشکلات کو حل کرنے کا باعث بنے گا- اللہ تعالیٰ اس خدمت کو حسن قبول عطا فرمائے-

خالد مسعود

ناظم ادارہ تدبر قرآن وحدیث لاہور

فہم قرآن کے لئے چند بنیادی اصول

جس طرح دین کو سمجھنے کے لئے چند بنیادی حقائق کو ماننا لازمی ہے اسی طرح قرآن مجید کو سمجھنے اور ماننے کے لئے چند بنیادی حقائق یا اصول موضوعہ کو ماننا اور سمجھنا ضروری ہے- اگر ان میں سے کسی ایک اصول میں بھی تردد باقی رہا تو وہ قرآن مجید کے سمجھنے پر لازماً اثر انداز ہوگا- اور اگر کسی اصول کو آپ نے صحیح طور پر نہیں سمجھا تو جس حد تک آپ نے اسے نہیں سمجھا ہے اس حد تک وہ آپ کے فہم قرآن پر اثر انداز ہوگا- اور اگر آپ ان میں سے کسی کو سرے سے مانتے ہی نہیں تو ہو سکتا ہے کہ آپ کے لئے فہم قرآن کی راہ یک قلم مسدود ہی ہو جائے- ان اصولوں کی حیثیت بنیادی کلیات کی ہے جن کو جانے بغیر چارہ نہیں- تاریخ انسانی میں غالباً وہ فیصلہ کن دور اب آگیا ہے جب ان کو سمجھ لینا اور ان کے بارے میں یکسو ہو جانا ضروری ہو گیا ہے- اب میں ان اصولوں میں سے ایک ایک پر بقدر ضرورت گفتگو کروں گا-

۱- قرآن مجید کی دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے

سب سے پہلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ قرآن مجید کی تمام دعوت عقل اور فطرت پر مبنی ہے اور اس کی اپیل بھی تمام تر عقل و فطرت ہی سے ہے- قرآن مجید جو دعویٰ بھی کرتا ہے اس کو عقلی و فطری دلائل سے ثابت اور مدلل کرتا ہے- اس کے باوجود جب مخاطب اس بات کو نہیں مانتے تو وہ ان کو ملامت کرتا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم عقل سے کام نہیں لیتے ؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم سمجھتے نہیں ؟

وہ قدم قدم پر مخاطبوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اس نے یہ انداز اس لئے اختیار کیا ہے کہ وہ سمجھ سکیں-

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۱۸، آل عمران)

(ہم نے تمہارے لئے نشانیوں کو کھول دیا ہے، اگر تم عقل سے کام لینے والے ہو)

جب ضدی اور ہٹ دھرم مخاطب ان دلائل کو خاطر میں نہ لاتے تو قرآن اس پر حیرت کے سے انداز میں کہتا ہے-

اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۷۵، مائدہ)

(دیکھو ہم کیسے ان کے لیے دلائل کو واضح کرتے ہیں اور دیکھو یہ کہاں الٹ دیے جاتے ہیں)

قرآن مجید نے عقل سے کام نہ لینے والے انسانوں کو بدترین چوپائے قرار دے کر ان کی سرزنش کی ہے- فرمایا :-

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ- (۲۲، انفال)

(اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے)

یہ انداز بیان صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس کی اپیل تمام تر عقل سے ہے اور جب لوگ عقل پر پٹی باندھ لیتے ہیں تو وہ ان کے اس رویہ پر ان کو ملامت کرتا اور بتاتا ہے کہ یہ رویہ انسانی شرف سے مطابقت رکھنے والا نہیں ہے-

جو شخص بھی قرآن مجید کو غور سے پڑھے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن اپنے دلائل آفاق و انفس سے لیتا ہے- چنانچہ فرمایا بھی ہے کہ :

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ-

(۵۳، حم السجدہ)

(ہم انہیں اپنی نشانیاں دکھاتے رہیں گے، آفاق میں بھی اور ان کے نفسوں میں بھی، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن بالکل حق ہے)

آفاقی دلائل سے مراد کائنات میں موجود شواہد ہیں، مثلاً رات دن کا تسلسل، سورج اور چاند کی گردش، ہواؤں کے تصرفات، پہاڑوں اور سمندروں کے عجائبات، وسائل رزق کا انتظام وغیرہ- انفسی دلائل سے مراد انسانی نفسیات اور اس کے اندر ودیعت کردہ حقائق و مسلمات ہیں- آفاق و انفس کے دلائل ہی کی روشنی میں قرآن مجید نے خالق کائنات اور اس کی صفات کو بیان کیا ہے- انہی کی روشنی میں اس کائنات کے متعلق جو صحیح تصور انسان کا ہونا چاہیے اس کو بتایا ہے- انہی کی اساس پر اس نے توحید کو ثابت اور شرک کا ابطال کیا ہے- اور یہی وہ دلائل ہیں جن سے اس نے جزا و سزا کو بھی ثابت کیا ہے- یہاں ان دلائل کی تفصیل کا موقع نہیں ہے، محض توجہ دلانے کے لئے چند آیات کا حوالہ دیا جاتا ہے- مثلاً فرمایا ہے-

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ-

(۱۶۳، البقرہ)

(بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد، اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے سمندر میں نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے بادلوں سے اتارا

اور جس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشی اور جس سے اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مامور ہیں، ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔)

اس آیت میں قرآن نے آسمان و زمین دونوں کے توافق اور ہم آہنگی کو بیان کر کے یہ دلیل قائم کی ہے کہ یہ ہرگز ممکن نہیں کہ آسمان کے اندر ایک ارادہ کام کر رہا ہو اور زمین پر کوئی دوسرا۔ ان کی کامل ہم آہنگی اس بات کا ثبوت ہے کہ زمین سے آسمان تک ایک ہی ذات کا ارادہ کارفرما ہے۔ ایک نہایت ہی زبردست اور حکیم قوت قاہرہ ہے جو انہیں کنٹرول کیے ہوئے ہے اور اس کارخانے کے ہر گوشہ میں جو عظیم حکمت ہے وہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ یہ کارخانہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے لیے ایک یوم الحساب بھی آئے۔ چنانچہ ارشاد ہے :-

وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ۔ (۱۱،ق)

(اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا، جس سے ہم نے باغ بھی اگائے اور کاٹی جانے والی فصلیں بھی اور کھجور کے بلند و بالا درخت بھی جن میں تہ بہ تہ خوشے لگتے ہیں بندوں کی روزی کے لیے، اور ہم نے اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ اسی طرح مرنے کے بعد زمین سے نکلنا بھی ہوگا۔)

یہاں آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف ایک ایسے زاویہ سے توجہ دلائی ہے جس سے آسمان و زمین کے درمیان توافق کے پہلو سے توحید کی شہادت بھی ملتی ہے، ان کے اندر ربوبیت کے جو اسباب ودیعت ہیں ان سے اس دنیا کے بعد آخرت اور اس جزا و سزا کا لزوم بھی سامنے آتا ہے، اور بارش سے مردہ زمین کے اندر جو حیات تازہ نمودار ہوتی ہے اس سے

حیات بعد الممات کے وقوع کا بھی مشاہدہ ہر شخص کو ہوتا ہے۔

اسی طرح قرآن نے انفس کے دلائل سے جگہ جگہ استشہاد کیا ہے۔ فرمایا :-

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔ (۷-۱۰،الشمس)

(شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا۔ پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔)

یہاں اس بات پر دلیل قائم کی ہے کہ اپنے آپ کو غیر مسئول اور شتر بے مہار سمجھنے کا تصور انسان کے خود اپنے نفس کی شہادت کے خلاف ہے۔ خالق نے اس کی تشکیل اس طرح فرمائی کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودیعت ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نیکی کو اختیار کرے اور بدی سے اپنے آپ کو بچائے۔ نیکی اور بدی کا شعور دینے کے بعد یہ بالکل ناممکن ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک اور بد دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ کرے۔

قرآن نے انسانی فطرت کے حوالہ سے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ جب انسان کو نیکی کا علم ہے تو وہ بدی کا ارتکاب کیوں کرتا ہے؟ اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ایسا وہ اس لئے نہیں کرتا کہ وہ اپنی فطرت کے تقاضے سے بے خبر ہے بلکہ حقیقت میں وہ شہوات و رغبات کے غلبے کی وجہ سے یہ حرکت کر جاتا ہے۔ ورنہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جس برائی کا وہ خود ارتکاب کرتا ہے وہی برائی جب دوسرا اس کے ساتھ کرتا ہے تو وہ سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ یہ مضمون سورہ تطفیف میں قرآن نے نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ سورہ قیامہ میں :-

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (نہیں، قسم ہے نفس ملامت گر کی)

فرما کر یہ خبر دی ہے کہ انسان خود اپنے ضمیر کے اندر ایک نگران رکھتا ہے جو اس سے صادر ہونے والی برائیوں پر اس کو ٹوکتا رہتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان دنیا میں شتر بے مہار نہیں ہے بلکہ اس کے لئے پرسش کا دن لازماً آنے والا ہے۔ اس سورۃ کی آیت

بَلِ الْاِنسانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ۔ (۱۴-۱۵ قیامہ)

(بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے)

میں بھی اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔

قرآن مجید نے انسانی فطرت ہی کے تقاضوں کی روشنی میں متعدد تمثیلات سے یہ سمجھایا ہے کہ انسانی فطرت شرک کے عقیدہ سے ابا کرتی ہے۔ نیز وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ خالق کائنات نیکوں اور بدوں کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق الگ الگ معاملہ کرے پھر لوگوں کو کیوں اصرار ہے کہ وہ خدا کے شریک ٹھہراتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خدا کا معاملہ نیکوں اور بدوں کے ساتھ یکساں ہو گا؟ مثلاً فرمایا

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیْہِ شُرَکَآءُ مُتَشٰکِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ بَلْ اَکْثَرُ هُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۲۹-زمر)

(اللہ تمثیل بیان کرتا ہے ایک غلام کی جس میں کئی مختلف الاغراض آقا شریک ہیں، اور ایک دوسرے غلام کی جو پورے کا پورا ایک ہی آقا کی ملک ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو گا! سزاوار شکر صرف اللہ ہے، لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں سمجھتی۔)

اس تمثیل میں توحید کی نفسیاتی دلیل ہے۔ فرمایا ہے انسانی فطرت بیک وقت بہت سے خداؤں کی غلامی پر راضی نہیں ہو سکتی۔ انسان ایک بلند حوصلہ مخلوق ہے۔ وہ کسی کی غلامی پر آسانی سے راضی نہیں ہوتا۔ مشرک کئی دیوتاؤں کی بندگی کی ذلت کو گوارا کرتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انسانیت کے شعور اور شرف کے صحیح احساس سے بالکل محروم ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن نے یہ بھی سمجھایا ہے کہ جب تم اپنے لائق اور نالائق غلاموں میں فرق کرتے ہو تو خدا سے متعلق یہ گمان کیوں رکھتے ہو کہ وہ اپنے باغی اور فرمانبردار بندوں کے ساتھ یکساں معاملہ کرے گا۔

اوپر کی اس تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید نے انسان کی

عقل کو بنیادی اہمیت دے کر اپنی دعوت عقلی دلائل کے زور کے ساتھ پیش کی ہے۔ اس کے دلائل کے مآخذ آفاق اور انفس ہیں۔ وہ فلسفہ تاریخ سے بھی استشہاد کرتا ہے اور تاریخ کے متعلق معلوم ہے کہ وہ آفاق ہی کا ایک حصہ ہے۔

حیرت ہے کہ ان شواہد کے باوجود ہمارے ہاں یہ چیز کس طرح ذہنوں پر مسلط ہو گئی کہ قرآن بس مان لینے کی چیز ہے اس کو عقل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ امام غزالیؒ، جو ایک عقلی آدمی بلکہ عاقلوں کے امام سمجھے جاتے ہیں، اپنی کتاب مستصفی میں اصول فقہ کا تعارف کراتے ہوئے بڑی بے تکلفی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "اب تک ہمارا تعلق جن علوم سے رہا ان کا تعلق تو حافظہ سے تھا لیکن اب ہم جس فن سے تعرض کر رہے ہیں اس کا تعلق عقل سے ہے"۔ حافظہ سے تعلق رکھنے والے علوم میں انہوں نے گویا قرآن و حدیث کے علوم کو شامل کیا ہے۔ جبکہ عقل سے تعلق رکھنے والا علم ان کے نزدیک اصول فقہ ہے۔

یہی حال دوسرے متکلمین کا بھی ہے۔ امام رازیؒ بسا اوقات اشاعرہ کے کلامی نظریات کو صحیح ثابت کرنے میں حدود سے اس قدر متجاوز ہو جاتے ہیں کہ اگر کوئی آیت ان کو صریحاً مسلک اشاعرہ کے خلاف نظر آتی ہے تو اس کی تردید میں یہ کہنے میں بھی ان کو باک نہیں ہوتا کہ ہمارا جو اصول برہانیات سے ثابت ہے وہ محض اس بناء پر مجروح نہیں ہو سکتا کہ ایک آیت کے الفاظ، جن کی دلالت تمام تر سماع پر مبنی ہے، اس کے خلاف ہیں۔ برہانیات سے امام رازیؒ کی مراد کلامی دلائل ہوتے ہیں۔

اشاعرہ کا عام مسلک یہ ہے کہ نبی کو ہم نے معجزات کے ذریعہ سے پہچانا اور جب نبی کو مان لیا تو جو کچھ وہ کہتا ہے ہم اس کو مانتے ہیں۔ اس میں عقل کا کیا سوال ہے؟ اشاعرہ کے اس قول کے برعکس قرآن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسی معجزات کی حوصلہ افزائی بالکل نہیں کرتا۔ قریش نے آنحضرت ﷺ سے جب جب حسی معجزات کا مطالبہ کیا تو ان کو یہ جواب دیا گیا کہ آفاق پر کیوں غور نہیں کرتے، انفس کے دلائل کو کیوں نظر انداز کر

رکھا ہے! عقل سے کام لو- معجزات دیکھنے کے باوجود بھی قومیں ماضی میں ایمان نہیں لائیں-

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ-

(۵۹، بنی اسرائیل)

(اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلا دیا-)

سورۃ انعام آیت ۳۵ میں نبی ﷺ پر واضح فرمایا کہ اگر یہ لوگ معجزات مانگتے ہیں تو ہم تو انہیں معجزات دکھانے کے حق میں نہیں- تم اگر آسمان میں سیڑھی لگا کر یا زمین میں سرنگ کھود کر کوئی نشانی لا سکتے ہو تو لا کر انہیں دکھاؤ-

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ کو معجزات دیئے ہی نہیں گئے- معجزات آپ نے دکھائے لیکن قرآن مجید کی دعوت کو ماننے کے لیے معجزہ دیکھنے کی شرط کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی گئی- شاید ہی کوئی بڑی سورہ ایسی ہو جس میں حسی معجزات کی شرط لگانے والوں کو اندھے اور بے بصیرت نہ کہا گیا ہو- اگر واقعی دین کی بنیاد معجزات پر ہوتی تو چاہئے یہ تھا کہ سب سے پہلے اسی بنیاد کو ثابت کیا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا- بلکہ قرآن مجید نے سابق انبیاء کے ان دلائل اور حجتوں کو بڑے زور سے پیش کیا ہے جو تمام تر عقلی استدلال اور عقلی حجت پر قائم ہیں- پس معلوم ہوا کہ ہماری عقلی غذا معجزات نہیں بلکہ عقلی دلائل ہیں- معجزات صرف اتمام حجت اور قطع عذر کے لئے دکھائے گئے ہیں جب خدا نے ایسا چاہا ہے-

اشاعرہ کے فلسفہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کو ایک مادر زاد اندھے کی طرح فرض کرتے ہیں جو ایک عصا کش کا محتاج ہوتا ہے- کوئی اس کی لٹھیا پکڑ کر چلائے تو اس کے پیچھے پیچھے وہ چلتا ہے- اس کے برعکس قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت اور عقل کے اندر ایک نور رکھا ہے- وہی نور انسان کا اصلی جوہر ہے- اسی سے انسان، انسان بنتا ہے ورنہ انسان اور جانور میں اصلاً کوئی فرق نہیں رہ جاتا- صرف شکل و صورت ہی کا فرق رہ جاتا ہے- انسان کا اصلی جوہر اور اصلی کمال یہی نور ہے- اسی کے اوپر اس

کے تمام عروج اور تمام سعادت کا انحصار ہے- فطرت اور عقل کا یہی نور ہے جس کو قرآن نے "بینہ" سے تعبیر کیا ہے اور جس کا درجہ یہ ہے کہ جب اس پر وحی کے نور کا اضافہ ہو جاتا ہے تو انسان کا باطن نور علیٰ نور ہو جاتا ہے- یہ مقام خاص انبیائے کرام کو حاصل ہوتا ہے-

قرآن مجید کے اس دعویٰ کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ عقل کے بارے میں نہ تو تشکیک میں مبتلاء فلسفیوں کی رائے درست ہے، نہ عقل پر کلی اعتماد کرنے والوں کی- اہل تشکیک کے نزدیک تو عقل گویا محض دھوکہ دینے کے لئے ہے- ان کو اپنے حواس، مشاہدہ اور اپنے عقلی اور اکات میں سے کسی چیز پر بھی اعتماد نہیں- اسی طرح قرآن ان لوگوں کے دعوے کو بھی تسلیم نہیں کرتا جو کہتے ہیں کہ عقل ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہے، ہم کسی اور چیز کے محتاج نہیں- واقعہ یہ ہے کہ عقل ٹھوکر بھی کھا جاتی ہے، یہ نفس کی رشوت بھی قبول کر لیتی ہے، اسے مرعوب بھی کیا جا سکتا ہے، یہ مغلوب بھی ہو جاتی ہے اور دھونس میں بھی آ جاتی ہے-

ہمارے نزدیک یہ دونوں ہی حق سے دور ہیں- جن لوگوں نے عقل کو بالکل ہی مطعون کر دیا ان لوگوں نے تو گویا اپنے اندر کے اصل چراغ ہی کو گل کر دیا- جن لوگوں نے عقل کو کافی سمجھ لیا انہوں نے عقل کے اوپر اس سے زیادہ اعتماد کر لیا جتنا اعتماد اس پر کرنا چاہیے- یہ دونوں راستے غلط ہیں- صحیح راستہ قرآن نے بتایا ہے کہ انسان کا نور اس کی فطرت اور عقل کی صورت میں اس کے پاس ہوتا ہے- اس نور کے اوپر وحی کا نور آ کر انسان کو بالکل جگمگا دیتا ہے- اس کے بعد عقل اگر وحی کی روشنی میں چلے گی تو کبھی ٹھوکر نہیں کھائے گی- اگر کبھی ٹھوکر کھائے گی بھی تو امید ہے کہ جلد متنبہ ہو کر سلامتی کے راستے پر لوٹ آئے گی-

پس قرآن مجید کو پڑھتے وقت یہ بات پیش نظر ہونی چاہیے کہ یہ ہماری فطرت اور عقل کا بیان ہے- لہذا اس میں جو کچھ ہے وہ انسانی فطرت اور عقل کے مطابق ہے- اگر قرآن

مجید کے بیان اور فطرت میں بظاہر تصادم معلوم ہوتا ہو تو وہاں ہمیں رک کر غور کرنا ہوگا کہ یہ تصادم کیوں ہے۔ یہ مقام ایک کشمکش کا مقام ہو سکتا ہے۔ ایسے مقام پر جب ہم اچھی طرح غور کریں گے تو فکر کی وہ خامی معلوم ہو جائے گی جس کے سبب سے مغالطہ ہوا۔ ایسا مغالطہ اللہ تعالیٰ رفع فرما دیتا ہے، انسان کی غلط فہمی دور ہو جاتی ہے اور قرآن کے بیان پر ایمان و یقین محکم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید عقل کی رہنمائی کے لئے ہے۔ اس لئے جب آپ عقل سے کام لیں گے تب تو اس کی ضرورت پڑے گی اور یہ زندگی کے مسائل حل کرنے میں آپ کو مدد دے گا۔ لیکن اگر آپ عقل کو بالائے طاق رکھ کر قرآن مجید کو پڑھیں گے تو اس سے ثواب تو شاید حاصل کر لیں زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں اس سے کوئی مدد حاصل نہیں کر سکتے۔

۲۔ قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے

فہم قرآن کے لیے دوسرا اصول یہ ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔ یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ قرآن مجید، جس کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے اور فی الواقع معجزہ ہے بھی، ایک بڑے گروہ کے نزدیک نظم سے بالکل خالی کتاب ہے۔ ان کے نزدیک نہ ایک سورہ کا دوسری سورہ سے کوئی ربط و تعلق ہے، نہ ایک سورہ کی مختلف آیات ہی میں باہم کوئی مناسبت و موافقت ہے۔ ان کے خیال میں یوں ہی کیف ما اتفق ایک سورہ کے بعد دوسری سورہ اور دوسری سورہ کے بعد تیسری سورہ نقل کر دی گئی ہے۔ ان کی ترتیب کو بدلا بھی جا سکتا ہے، یہ آگے پیچھے بھی ہو سکتی ہیں اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا فضول خیال ایک ایسی عظیم کتاب کے متعلق لوگوں کے اندر کس طرح جاگزیں ہو گیا ہے جس کے متعلق دوست و دشمن دونوں ہی کو اعتراف ہے کہ اس نے دنیا میں ہل چل پیدا کر دی، اذہان و قلوب بدل ڈالے، فکر و عمل کی نئی بنیادیں استوار

کیں اور انسانیت کو ایک نیا جلوہ دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید کی تمام ترتیب شروع سے لے کر آخر تک خواہ وہ آیات کی آیات کے ساتھ یا سورتوں کی سورتوں کے ساتھ یا گروپوں کی گروپوں کے ساتھ ہو، تمام تر توقیفی ہے۔ "توقیفی" ایک اصطلاح ہے جس سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جبریل امین کے واسطہ سے، حضرت محمد ﷺ کی ہدایت کے تحت کاتبین وحی کے ذریعہ سے انجام پائی ہے اور اس ترتیب عظیم کی نگرانی میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا فرض ادا کیا، خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا فرض ادا کیا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا فرض مکمل طریقے پر ادا کیا تاکہ امت کی طرف سے سبکدوش ہو جائیں۔

اب اگر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ قرآن مجید کی اصل ترتیب کیا ہے؟ اس کا نظام کیا ہے؟ فلاں صاحب کے مصحف میں یہ یہ سورتیں کیوں نہ تھیں اور فلاں صاحب کے مصحف میں اس سورہ کے بعد فلاں سورہ یا اس آیت کے بعد یہ آیت کیوں تھی تو اس قسم کے سوالات بے خبری پر مبنی ہیں۔ جب یہ واقعہ ہے کہ قرآن مجید کی ایک ایک آیت کے متعلق جب وہ نازل ہوئی تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ اس آیت کو فلاں سورہ میں فلاں آیت سے پہلے اور فلاں آیت کے بعد رکھو تو ظاہر ہے کہ یہ ہدایت اتفاقی نہیں ہو گی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ایماء کے مطابق ہو گی۔ نزول قرآن کے زمانہ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ قرآن مجید کی ایک کاپی چھاپ کر سب جگہ پھیلا دی جاتی۔ اس زمانے میں لوگوں نے اپنے اپنے نسخے رکھے تھے۔ جس کو جو سورہ ملتی اور جہاں موقع پاتا وہیں اسے لکھ لیتا۔ البتہ ان نسخوں کے علاوہ ایک سرکاری نسخہ بھی تھا جسے آنحضرت ﷺ نے کاتبین وحی سے باقاعدہ لکھوایا تھا اور جس کی ترتیب وہی تھی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ ہر رمضان المبارک میں جبریل امین جس قدر قرآن مجید نازل ہو چکا ہوتا اس کا مذاکرہ نبی ﷺ

سے کرتے۔۔جس سال آنحضرت ﷺ نے وفات پائی اس سال آخری رمضان المبارک میں یہ مذاکرہ دو مرتبہ ہوا۔ پورے قرآن مجید کی ترتیب کے لئے یہ سرکاری اہتمام تھا۔ قرآن مجید کی اس ترتیب کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے سورہ قیامہ میں فرمایا ہے :۔

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَه۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ۔ (القیامہ،۱۷-۱۹)

(ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا۔ تو جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔)

ظاہر ہے کہ جس ترتیب کا اہتمام اس درجہ کا ہوا ہو، اس کے رموز، اس کے حقائق، اس کا فلسفہ، اس کے اسرار، اس کے نکات، اس کے دقائق اور اس کے معارف کی کوئی حد ہی نہیں ہو سکتی۔ اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ترتیب منصوص بھی ہے۔

اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ۔ (حجر۔۸۷)

(اور ہم نے تم کو سات مثانی اور قرآن عظیم عطا کئے۔)

سات مثانی سے مراد خود قرآن مجید ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ دوسری جگہ یہ تصریح موجود ہے کہ پورا قرآن مثانی ہے، فرمایا :۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ ۔ (زمر۔۲۳)

(اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، کتاب باہم دگر مشابہ، جوڑے جوڑے۔)

مثانی، مثنیٰ، کی جمع ہے۔ مثنیٰ، اس چیز کو کہتے ہیں جو دو دو کر کے ہو، مثنیٰ کا مطلب بار بار دہرائی ہوئی لینا، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، لغت سے ثابت نہیں۔ قرآن میں یہ لفظ جہاں استعمال ہوا ہے وہاں دو دو کے مفہوم ہی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰی وَ فُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَکَّرُوْا۔ (سبا،۴۶)

(یہ کہ اٹھو اللہ کے لئے دو دو کر کے اور ایک ایک کر کے، پھر غور کرو۔)

فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ...... (النساء۔۳)

(تو عورتوں میں سے جو تمہارے لئے جائز ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر لو۔)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید نے کسی خاص سورہ کو مثنیٰ نہیں کہا بلکہ پوری کتاب کو کہا ہے "کتابا متشابہا مثانی" کہ یہ کتاب دو دو کی صورت میں ہے اور اس کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ ہم رنگ اور ہم آہنگ ہیں جن میں کوئی تضاد و تناقض نہیں پایا جاتا۔

قرآن مجید کی تلاوت اگر غور و تدبر کے ساتھ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورتیں جوڑا جوڑا ہیں۔ ہر سورہ اپنا مثنیٰ رکھتی ہے۔ ان دونوں میں اسی طرح کی مناسبت ہے جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ ایک میں جو پہلو مخفی ہے دوسری اس کو اجاگر کرتی ہے۔ اگر آپ سورتوں کی اس ترتیب پر ایک نظر ڈالیں جس ترتیب سے وہ مصحف میں ہیں تو یہ چیز بھی آپ کو بالکل صاف نظر آئے گی کہ قرآن مجید میں مکی اور مدنی سورتوں کے ملے جلے سات گروپ بن گئے ہیں جن میں سے ہر گروپ ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے۔ ہر گروپ میں پہلے مکی سورتیں ہیں، ان کے بعد مدنی سورتیں ہیں۔ جب میرے سامنے قرآن عظیم کے یہ ساتوں گروپ آتے ہیں اور ساتھ ہی سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے پر نظر پڑتی ہے تو بے ساختہ میرا ذہن "وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اسی بنیاد پر میں قرآن عظیم کی ترتیب کو منصوص مانتا ہوں۔

فرض کر لیجئے کہ کوئی صاحب یہ کہتے ہیں کہ فلاں گروپ میں فلاں سورہ کو کسی نے

مکی کہا اور کسی نے مدنی کہا تو یہ بات اہمیت نہیں رکھتی۔ کسی سورہ کے مکی اور مدنی ہونے کا تعلق تمام تر اس کے مضمون سے ہے۔ میں نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ کس طریقہ سے قرآن مجید سات گروپوں میں ہے۔ یہ ساتوں گروپ نہایت محکم ہیں اور ان میں پہلے ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتیں ہیں اور اس کے بعد ایک یا ایک سے زیادہ مدنی آتی ہیں۔ یہ ساتوں گروپ ملتے جلتے ہیں اور ان کے درمیان امتیاز بھی ہے۔ یعنی بعض پہلوؤں سے ایک گروپ دوسرے گروپ سے ممتاز ہے۔ ہر گروپ میں مضامین مختلف اسلوبوں سے دہرائے گئے ہیں۔ کسی میں توحید کا پہلو زیادہ نمایاں ہے، کسی میں معاد کا اور کسی میں رسالت کا۔ اسی طرح یہ بات بھی قرآن مجید نے بار بار واضح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کی باتیں اور اپنی آیات مختلف شکلوں اور گوناگوں پیرایوں میں پیش کی ہیں۔ آپ قرآن مجید کی تلاوت کریں گے تو محسوس کریں گے کہ ایک مضمون ساتوں گروپوں میں بار بار سامنے آیا ہے لیکن وہ ایک ہی طریقہ سے بیان نہیں ہوا بلکہ وہی مضمون مختلف اسلوبوں سے اس طرح بیان ہوا ہے کہ اگر آپ ایک جگہ بات کو نہیں سمجھے تو دوسری جگہ سمجھ جائیں گے اور دوسری جگہ نہیں سمجھے تو تیسری یا چوتھی جگہ بات سمجھ میں آجائے گی، اور اس طرح سے سمجھ میں آئے گی کہ کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ جائے گی۔

اگر فی الواقع قرآن مجید میں کوئی نظم و ترتیب نہیں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی ایک ایک آیت کو دوسری آیات سے جوڑنے کے لیے اس درجہ اہتمام کی کیا ضرورت تھی؟ اگر ترتیب محض اتفاقی ہوتی تو بہترین ترتیب تو نزولی ہوتی۔ جس ترتیب سے آیتیں نازل ہوئی تھیں اسی ترتیب سے مصحف میں جمع کر دی جاتیں۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ مصحف کی ترتیب نزولی نہیں ہے بلکہ آنحضرت ﷺ کی خاص ہدایات کے تحت خاص خاص آیات کے لیے خاص خاص مواقع معین کیے گئے ہیں۔ دوسری مناسب ترتیب مقداری ہو سکتی تھی یعنی آیتیں برابر مقدار میں مختلف سورتوں میں جمع کر دی جاتیں لیکن ہر

شخص دیکھ سکتا ہے کہ سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔ اور کتنی ہی چھوٹی سورتیں ایسی ہیں جو اپنے سے بڑی سورتوں پر مقدم ہیں۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس ترتیب کے اندر معنوی حکمت نہیں ہے تو یہ ترتیب کیوں اختیار کی گئی؟ غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے گروپ میں جو باتیں ہیں وہ پہلے ہی گروپ میں موزوں ہیں اور آخری گروپ میں جو باتیں ہیں وہ آخری گروپ ہی کے لیے موزوں ہیں۔ پہلے گروپ میں قانون و شریعت ہے اور آخری گروپ میں جھنجھوڑ دینے والی سورتیں ہیں۔ ان دونوں میں وہی تعلق ہے جو ایک عمارت اور اس کی بنیاد میں ہوتا ہے۔ البتہ یہ باتیں سمجھنے کے لیے برسوں کی کاوش درکار ہے۔ جو شخص زندگی کھپائے وہی اس میں سے کچھ حصہ پا سکتا ہے۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی ترتیب میں نظم کی یہ بات جو آپ کہتے ہیں آپ سے پہلے لوگوں نے یہ نہیں کہی۔ میرے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس راہ میں پہلا مدعی نہیں ہوں بلکہ میں بعد میں آنے والوں میں سے ہوں۔ یہ بات تو پہلے بھی کہی گئی ہے لیکن عاقلوں کی بات بہت کم لوگ ہی سنتے اور یاد رکھتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ نظم کی بات کہنے والے پہلے بھی تھے جو نظم کی تلاش اور جستجو میں رہتے تھے۔ اس چیز کا دعویٰ سلف میں بہتوں نے کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ رازیؒ قرآن کے نظم کے سب سے زیادہ مدعی تھے اگرچہ جو نظم رازیؒ بیان کرتے ہیں وہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس سے اطمینان نہیں حاصل ہوتا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرامؓ کے علاوہ ایسے علماء بھی گزرے ہیں جنہوں نے نظم قرآن کی حکمت پائی، اس کی حلاوت سے آشنا ہوئے اور انہوں نے صاف صاف یہ بھی کہا کہ ہم نے اس علم کے قدردان نہیں پائے۔ یعنی لوگوں نے ان کے علم سے استفادہ نہیں کیا۔ اس وجہ سے ان کا علم ان کے ساتھ ہی رہا۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے علم میں لوگ ہمیشہ ایک درجے کے نہیں رہے ہیں بلکہ مختلف درجات کے لوگ رہے ہیں۔ جو درجہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ یا مجاہدؒ یا عکرمہؒ کا ہے وہ درجہ ہر کسی کا تو نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید کے نظم اور ترتیب کی حکمت غور، تدبر اور محنت سے تعلق رکھتی ہے لیکن محنت شاقہ جو علم اور حقیقت رسی کے لیے مطلوب ہے اگر ناول پڑھنے میں صرف ہونے لگے تو فکر و فلسفہ پر کون سر کھپائے گا اور اگر حال یہ ہو کہ کسی کتاب میں لکھے ہوئے مسائل کو جان لینا کافی سمجھ لیا جائے تو اس کی حکمت کے جواہر ریزے تلاش کرنے میں سرگرداں ہونے کی مشقت کون برداشت کرے گا؟

اس زمانے میں لوگوں میں نئے نئے شوق ابھر رہے ہیں جس کے نتیجہ میں آخر کار یہ فتنہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ مستشرقین قرآن مجید کے ایسے نسخے چھاپ رہے ہیں، جن میں ان کے نزدیک قرآن کی ترتیب سائینٹفک کر دی گئی ہے۔ مسلمانوں کے اندر کے بعض زعماء تک کا حال یہ ہے کہ وہ اس حرکت میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر ﷺ نے قرآن کی جو ترتیب قائم کی ہے اس کے متعلق ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ کسی حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اس پر غور و تدبر کرنا ایک غیر ضروری کاوش اور کوہ کندن کاہ برآوردن کا مصداق ہے۔

میرے نزدیک، جیسا کہ اوپر دلائل سے واضح کیا گیا، قرآن مجید کی موجودہ ترتیب نہ صرف توقیفی ہے بلکہ منصوص بھی ہے۔ اس کی حفاظت ایک شرعی امر ہے۔ جو لوگ اس کی ترتیب کو الٹنا پلٹنا چاہتے ہیں وہ قرآن مجید کی حرمت کو ذبح کرنا چاہتے ہیں۔ امت کا فرض ہے کہ وہ اس فتنہ سے ہوشیار رہے، ترتیب قرآن کی حفاظت کرے، قرآن مجید کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لیے سر کی بازی بھی کھیلنی پڑے تو اس جہاد کے لیے تیار رہے اور اس ترتیب کے فکر و فلسفے پر غور کرے تاکہ اس کتاب مجید کی حکمتوں سے ناآشنا اور محروم نہ رہے۔

۳۔ قرآن حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی ہے

تیسرا اصول جو قرآن پر تدبر کرتے ہوئے پیش نظر رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ اس کو حق و باطل میں امتیاز کے لیے کسوٹی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس وجہ سے کوئی ایسی چیز جو قرآن مجید کے خلاف ہو قبول نہیں کی جائے گی۔ ارشاد ہے :۔

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡکَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ‌ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ‌ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَـقِّ‌ ۔ (المائدہ، ۴۸)

(اور ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری حق کے ساتھ، تصدیق کرتی ہوئی اس سے پیشتر سے موجود کتاب کی اور اس کے لیے کسوٹی بنا کر، تو ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا اور اس حق سے ہٹ کر جو تمہارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔)

مھیمن، اصل میں مؤامن ہے پہلا ہمزہ 'ہ' سے اور دوسرا 'ی' سے بدل گیا ہے۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ حشر آیت ۲۳ میں، اور قرآن مجید کی صفت کے طور پر بھی، جیسا کہ سورہ مائدہ کی مذکورہ آیت میں۔ ھیمن الطائر علی فراخه کا مطلب یہ ہو گا کہ پرندہ اپنے بچوں کے اوپر پر پھیلائے ہوئے منڈلا رہا ہے گویا ان کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہے۔ ھیمن فلان علی کذا، کے معنی ہیں کہ فلاں اس چیز کا محافظ اور نگران بن گیا۔ سابق صحیفوں پر قرآن مجید کے مہیمن ہونے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید کتاب الٰہی کا اصل معتمد نسخہ ہے اس لیے وہ دوسرے صحیفوں کے حق و باطل میں امتیاز کے لیے کسوٹی ہے۔ جو بات اس پر کھری ثابت ہو گی وہ کھری ہے اور جو بات اس پر پوری نہیں اترے گی وہ محرف ہے۔ مذکورہ آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب اتاری ہے جو تمام اختلافات کے درمیان قول فیصل اور سابق

صحیفوں کے لیے معیار اور کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے تو اب تم ہر معاملے کا فیصلہ اسی کی روشنی میں کرو- اس سے ہٹ کر ان منافقین اور یہود کی خواہشات و بدعات کی ہر گز پیروی نہ کرنا جو اپنی خواہشوں کے مطابق فیصلہ کرانے کے لیے تمہارے پاس آتے ہیں- اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اتارا ہی اس لیے ہے کہ وہ سابق صحیفوں کے لیے کسوٹی کا کام دے- قدیم صحیفے تورات، انجیل، زبور وغیرہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے نازل کردہ ہیں لیکن قرآن کے بعد اب یہ اسی حد تک مانے جائیں گے جس حد تک ان میں اور قرآن مجید میں موافقت ہے- جہاں قرآن مجید کے بیان میں اور ان صحیفوں کے بیان میں موافقت نہیں ہو گی وہاں قرآن مجید کا بیان ہی مانا جائے گا-

قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ بلند درجہ حدیث شریف کا ہے- جہاں تک ان حدیثوں کا تعلق ہے جن پر امت کا تواتر ہے وہ تو قرآن ہی کی طرح قطعی ہیں لیکن اخبار احاد میں بعض شبہات پیدا ہو سکتے ہیں- اس وجہ سے ان میں سے وہی قبول کی جائیں گی جو قرآن سے متصادم نہ ہوں-

نبی ﷺ کے متعلق معلوم ہے کہ آپ نے کوئی بات نہ قرآن کے خلاف فرمائی نہ فرما سکتے تھے- قرآن میں نہایت واضح الفاظ میں تصریح ہے کہ قریش نے جب یہ مطالبہ کیا کہ آپ یا تو اس قرآن میں ترمیم کریں یا اس کی جگہ کوئی اور قرآن لائیں تب ہم مانیں گے- اس کے بغیر ہم کسی طرح بھی قرآن مجید کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی زبان سے ان کو یہ جواب دلایا-

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ - اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ - (یونس، ۱۵)

(کہہ دو مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنے جی سے ترمیم کر دوں- میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے- اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو ایک ہولناک دن

کے عذاب سے ڈرتا ہوں-)

یعنی یہ میری کوئی اپنی تصنیف تھوڑے ہی ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم و تنسیخ کر دوں- یہ کلام تو مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتا ہے- میں بے چون و چرا اس کو پیش کرتا ہوں- میرا یہ منصب نہیں کہ اس میں رد و بدل کر دوں- اگر ایسا کر دوں تو کل کو خدا کے آگے کیا جواب دوں گا- معلوم ہوا کہ جب نبی ﷺ کو یہ اختیار ہی حاصل نہیں کہ وہ قرآن مجید میں کوئی ادنیٰ ترمیم کر سکیں تو آپ کا کوئی قول و فعل قرآن مجید کے خلاف نہیں ہو سکتا- روایتوں میں اگر آپ کا قول یا عمل قرآن کے خلاف نظر آئے جس کی کوئی توجیہ یا تطبیق نہ ہو سکے تو لازماً اس کے مقابل میں قرآن کو ترجیح دی جائے گی اس لیے کہ وہ کسوٹی ہے-

بعض غالی لوگ حدیث کو قرآن پر حاکم مانتے ہیں- امام احمد بن حنبلؒ سے جب اس کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ "میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ حدیث قرآن پر حاکم ہے البتہ حدیث تو قرآن کی مفسر اور اس کو واضح کرنے والی ہے"- امام صاحب نہ صرف بہت بڑے امام حدیث ہیں بلکہ اس فن شریف کے معاملہ میں ان کو صاحب البیت کا مقام حاصل ہے- جب ان کی رائے حدیث کے بارے میں یہ ہے تو کسی دوسرے کی رائے کو کیا وقعت دی جا سکتی ہے-

امام صاحب کی یہ رائے نہایت حکیمانہ اور قرآن کے مطابق ہے- قرآن مجید میں نبی ﷺ کو 'معلم کتاب' کہا گیا ہے-

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ - (آل عمران، ۱۶۴)

(یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی

آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔)

جب نبی ﷺ قرآن کے معلم ہیں تو ان سے بڑا قرآن کی تفسیر کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ نبی ﷺ نے قرآن کی جس طرح تفسیر فرمائی ہے اگرچہ احادیث میں اس کا بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن یہاں زیادہ تفصیل میں پڑنے کا موقع نہیں ہے۔ صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو کچھ اندازہ ہو سکے کہ حدیث کے تفسیر قرآن ہونے کا مدعا کیا ہے۔

بخاری شریف میں روایت ہے:۔

عن ابی هریرة رضی الله عنه قال جاء رجل الی رسول الله ﷺ فقال یا رسول الله من احق بحسن صحابتی قال امک، قال ثم من؟ قال امک، قال ثم من؟ قال امک، قال ثم من؟ قال ثم ابوك۔

(بخاری۔ کتاب الادب)

(ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا۔ "یارسول اللہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ فرمایا "تمہاری ماں" ۔بولا "پھر کون؟" ۔فرمایا "تمہاری ماں" ۔بولا "پھر کون؟"، فرمایا: "تمہاری ماں" ۔بولا "پھر کون؟" فرمایا: "پھر تمہارا باپ"۔)

قرآن مجید میں اس مضمون کو دیکھئے تو والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِىْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِىْ وَلِوَالِدَيْكَ۔ اِلَىَّ الْمَصِيْرُ۔ (لقمٰن، ۱۴)

(اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں نیک سلوک کی ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا کہ میرے

شکر گزار رہو اور اپنے والدین کے۔ میری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے۔)

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا۔ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا۔ وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا۔ (الاحقاف، ۱۵)

(ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دکھ کے ساتھ اس کو پیٹ میں رکھا اور دکھ کے ساتھ اس کو جنا۔ اور اس کو پیٹ میں رکھنا اور اس کو دودھ چھڑانا تیس مہینوں میں ہوا۔)

ان آیات میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ جہاں تک شکر گزاری اور خدمت کا تعلق ہے اس کا حکم تو باپ اور ماں دونوں کے لیے ہے لیکن قربانیاں صرف ماں ہی کی گنائی گئی ہیں۔ باپ کی کسی قربانی کا ذکر نہیں فرمایا۔ ان آیات میں حمل، ولادت اور رضاعت تینوں مراحل کی طرف اشارہ ہے اور ان تینوں کٹھن مراحل کا تعلق صرف ماں ہی سے ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف نے، جو قرآن مجید کی تفسیر ہے، ماں کا حق باپ سے تین درجہ زیادہ گنایا ہے۔ قرآن مجید میں بات ایک الگ اسلوب سے بیان ہوئی ہے۔ نبی ﷺ نے اسی بات کو ایک دوسرے اسلوب سے واضح فرما دیا ہے۔ حقیقت دونوں جگہ ایک ہی ہے لیکن حدیث نے قرآن کے حکیمانہ اسلوب کی وضاحت فرما دی ہے۔

نبی ﷺ احادیث میں جو تفسیر بیان فرماتے ہیں اس کو سمجھنے کے لیے غور و تامل کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس میں حکمت کے وہ دقیق نکتے بھی آتے ہیں جن تک ہر شخص کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایک بات قطعی ہے کہ جس طرح مفسر کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ کوئی نکتہ اس نے قرآن مجید کی کس آیت اور اس کے کس لفظ سے لیا ہے اسی طریقہ سے جو کچھ احادیث میں ہو گا اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی اشارہ، قرینہ یا لفظ متعلقہ آیت میں لازماً موجود ہو گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن مجید کے الفاظ میں اس کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔ اوپر ہم نے جو مثال پیش کی ہے اس میں اس کی نہایت واضح شہادت موجود ہے۔

قرآن مجید اور حدیث شریف کا یہ تعلق بالکل واضح ہے- جب پیغمبر ﷺ کی زبان مبارک سے یہ بات کہلاوی گئی کہ قُلْ مَا يَكُونُ لِيْ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ تو کسی حدیث کا، خواہ وہ کسی درجہ کی ہو، ہرگز یہ مرتبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ قرآن مجید کے کسی حکم کو منسوخ کر دے- قرآن مجید کو اگر منسوخ کر سکتا ہے تو خود قرآن مجید ہی کر سکتا ہے- بعض فقہا یہ مانتے ہیں کہ مشہور حدیث قرآن مجید کی کسی آیت کی تخصیص یا تقید کر سکتی ہے لیکن وہ اس بات کو بھی اصول کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں کہ تخصیص کے قرائن کلام میں پہلے سے موجود ہونے چاہئیں- اگر چوری میں قطع ید کی سزا سے احادیث میں خاص خاص نوعیت کے افراد یا ایک خاص مقدار سے کم مقدار میں چوری کرنے والوں کو مستثنٰی کیا گیا ہے تو اس کے قرائن اس آیت میں بھی اور دوسرے مقامات میں بھی پہلے سے موجود ہیں بلکہ عام عقل کا بھی فیصلہ ہے کہ ہر گری پڑی چیز کو اٹھا لینے والا وہ چور نہیں جس پر 'السارق' اور 'السارقہ' کا اطلاق ہو اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے-

امام شافعیؒ کے ہاں بھی مخصص کے لیے ضروری ہے کہ اس کے قرائن پہلے سے موجود ہوں ورنہ اس کی حیثیت ناسخ کی ہو گی اور قرآن کا ناسخ صرف قرآن ہی ہو سکتا ہے، کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی- قرآن مجید میں جتنے بھی ناسخ اور جتنے بھی منسوخ ہیں وہ سب کے سب اس میں موجود ہیں اور یہی عقل کا تقاضا ہے- جب قرآن مجید کو قرآن مجید ہی منسوخ کر سکتا ہے تو یہ ضروری ہوا کہ اگر کسی چیز کو ہم کہتے ہیں کہ منسوخ ہے تو اس کے ناسخ کا بھی پتہ دیں کہ فلاں آیت اس کی ناسخ ہے- اگر ناسخ کا پتہ نہ دیا جا سکے تو کس دلیل کی بنا پر کسی چیز کو منسوخ قرار دیا جا سکے گا اور کوئی شخص اس کو باور کیوں کرے گا؟

۴- قرآن مجید قریش کی ٹکسالی عربی زبان میں نازل ہوا

فہم قرآن کے لیے چوتھی چیز جو پیش نظر رہنی چاہیے یہ ہے کہ قرآن مجید کا نزول قریش کی ٹکسالی زبان میں ہوا ہے- یہی زبان رسول اللہ ﷺ کی تھی- قرآن میں آتا ہے:

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ - (الدخان، ۴۴)

(سو ہم نے اسے تمہاری زبان پہ نازل کر کے آسان بنایا تا کہ وہ یاد دہانی حاصل کریں)

لہٰذا ضروری ہے کہ جو شخص قرآن کو سمجھنا چاہتا ہے وہ عہد نبوت اور عہد صحابہ کی عربی زبان سیکھے- معمولی عربی دانی فہم قرآن کے لیے ناکافی ہے-

بظاہر یہ ایک معمولی بات ہے اور اس کو اس اہمیت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی مگر ایک خاص طرح کی صورت حال کی وجہ سے اس پر بحث کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی- امام شافعیؒ نے اپنی اصول فقہ کی کتاب میں قرآن مجید کی زبان پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے- انہوں نے عربی زبان پر کامل عبور اور دسترس رکھنے کی ضرورت پر جس زور سے لکھا ہے اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی- لیکن غور کرنے پر معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ کے اس چیز پر اس قدر زور دینے کا سبب یہ ہے کہ دین اور شریعت کا ماخذ اور حق و باطل کے لیے کسوٹی قرآن مجید ہی ہے- اسی سے عقائد، فقہ اور حکمت کے اصول معین ہوتے ہیں- قرآن مجید کو سمجھنے میں اگر غلطی ہو جائے تو ہر چیز کی بنیاد ہی غلط ہو جائے گی-

علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ قرآن کی عربی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزے کی حد کو پہنچی ہوئی ہے- قرآن مجید نے خود کفار قریش کو چیلنج کیا ہے کہ تم اگر زیادہ نہ کر سکو تو ایک ہی سورۃ قرآن کی مانند پیش کر کے دکھا دو اور اگر تمہارے لیے تنہا اپنے بل بوتے پر یہ کام مشکل ہو تو تمہارے پاس ادیب و خطیب بھی ہیں، شاعر اور کاہن بھی، جنات اور شیاطین بھی ہیں اور تمہارے بہت سے دیوی دیوتا بھی، قرآن پاک کا مقابلہ کرنے کے لیے تم

ان سب کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرو- فرمایا-

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِی رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ - وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ -(البقرہ- ۲۳)

(اگر تم اس چیز کی جانب سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو لاؤ اس کے مانند کوئی سورہ اور بلا لو اپنے حمائتیوں کو اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو-)

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّأْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا - (بنی اسرائیل-۸۸)

(کہہ دو اگر تمام جن و انس متفق ہو کر بھی زور لگائیں کہ اس قرآن کی مثال پیش کریں تو اس کی مثال پیش نہ کر سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں-)

قرآن مجید کے اس چیلنج کے اصل مخاطب اگرچہ اہل عرب تھے، غیر اہل عرب کے لیے اس قسم کے چیلنج کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن قرآن کے ہر مخالف اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے ہر منکر کے لیے، خواہ وہ عرب سے تعلق رکھتا ہو یا عجم سے، قرآن کے زمانہ نزول سے لے کر آج تک، یہ چیلنج موجود ہے- یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ چودہ سو سال گزرنے پر بھی کوئی شخص قرآن مجید کی چھوٹی سے چھوٹی سورہ کی مانند بھی کوئی کلام پیش نہیں کر سکا-

عرب جاہلیت کے شاعروں اور خطیبوں، خاص طور پر شعرائے سبعہ معلقہ کی بڑی عظمت و عزت تھی- لبید شعرائے سبعہ معلقہ میں سے آخری شاعر ہیں- ان کا کلام اس قدر بلند پایہ تھا کہ ان کے ایک شعر پر سوق عکاظ میں تمام شعرائے عرب نے سجدہ کیا اور عرب کی روایت کے مطابق ان کا قصیدہ خانہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا- کسی کے کلام کا خانہ کعبہ میں آویزاں کیا جانا اس وقت سب سے بڑا اعزاز تھا- یہی لبید بعد میں مسلمان ہو گئے تو انہوں نے شعر کہنا ترک کر دیا- جو شاعر تمام عرب شعراء کا مسجود، وقت کا ملک الشعراء اور عرب کی

فصاحت و بلاغت کا مظہر کامل ہو، اس کا یوں ترک شعر لوگوں کے لیے تعجب کا باعث ہوا- کسی نے ان سے استفسار کیا کہ اب آپ شعر نہیں کہتے؟ تو انہوں نے جواب دیا "أبعد القرآن" (کیا قرآن کے بعد بھی اس کی گنجائش رہ گئی ہے) قرآن کے اعجاز بلاغت کے آگے سر افگندگی اور سپر اندازی کا یہ اظہار و اعتراف اس عظیم شاعر کی طرف سے ہے جو اپنے زمانے میں فصاحت و بلاغت کا نشان و علم تھا- جب وہ اس طرح قرآن مجید کے آگے سربسجود ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عرب کی تمام فصاحت و بلاغت نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے- اس کے بعد کسی اور کے لیے قرآن کے آگے نگاہیں اونچی کرنے کا کیا امکان باقی رہا!

عربی زبان سے ہمارا تعلق قرآن و حدیث کی بدولت ہے- اگر قرآن و حدیث سے اس کا تعلق نہ ہوتا تو یہ بھی زبانوں میں سے ایک زبان تھی- اس کے لیے ترجیح کا کوئی پہلو نہ تھا لیکن قرآن و حدیث، جن پر ہمارے دین کا انحصار ہے، عربی زبان میں ہیں اس لیے امت کے ایک گروہ پر فرض ہے کہ وہ اس عربی کو لازماً سیکھے اور اس میں پوری مہارت حاصل کرے جس میں قرآن نازل ہوا ہے- اس گروہ کو زبان میں وہ مرتبہ اور مقام حاصل ہو کہ وہ پورے اطمینان سے فیصلہ کر سکے کہ فلاں آیت یا فلاں لفظ کا مفہوم کیا ہے- یہاں تک کہ اس کو بڑے سے بڑے ماہر زبان پر بھی تنقید کرنی پڑے تو وہ اس پر بھی تنقید کر کے اس کے حق اور باطل کو ممیز کر سکے- جن لوگوں کو یہ مقام حاصل ہو جائے وہ بیشک قرآن اور حدیث پر غور کر سکتے ہیں، اس سے استنباط کر سکتے ہیں اور یہ بتا سکتے ہیں کہ یہاں امر کس مقصد کے لیے ہے اور نہی سے کیا مراد ہے؟ ظاہر خطاب کن لوگوں سے ہے اور کلام کا اصل رخ کن کی طرف ہے؟

اس وقت ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ وہ زبان جس میں قرآن مجید نازل ہوا کہیں بھی رائج نہیں ہے- عرب اور عجم دونوں ہی میں جو عربی پڑھی، پڑھائی اور لکھی بولی جاتی ہے وہ

اپنے اسلوب و انداز، اپنے لب و لہجہ اور الفاظ و محاورات میں اس زبان سے بہت مختلف ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ ہمارے عربی مدارس میں جو عربی پڑھی پڑھائی جاتی ہے وہ قلیوبی، نفحۃ الیمن یا زیادہ سے زیادہ حریری و متنبی کے انداز کی عربی ہے۔ عرب، شام اور مصر میں جو عربی رائج اور مقبول ہے اس کا اندازہ ان ممالک کے رسائل و اخبارات سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ زبان عربی ضرور ہے لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ اس کے اسلوب (Style) میں بہت تبدیلی آچکی ہے۔ ہر دور میں عجمی زبانیں اس پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں اور موجودہ دور میں تو اس کے اسالیب پر مغربی زبانیں مثلاً انگریزی اور فرانسیسی زیادہ غالب ہیں۔ آپ کو عربی اخبار پڑھتے ہوئے محسوس ہوگا کہ یہ انگریزی زبان کا بالکل لفظی ترجمہ ہے۔ یہ زبان قرآن کی زبان سے اس قدر مختلف ہے کہ اس کا ذوق نہ صرف یہ کہ قرآن کی زبان کا کوئی ذوق پیدا نہیں کرتا بلکہ قرآن سے بیگانہ کرتا ہے۔

قرآن کی زبان سیکھنے کے وسائل

قرآن و حدیث کی معاصر زبان چونکہ نہ عربی مدارس میں ملتی ہے اور نہ اخبارات و رسائل میں، اس لیے اس کو سیکھنے کے لیے نہایت کاوش، جاں فشانی اور مستعدی کی ضرورت ہے۔ اگرچہ یہ ایک کٹھن کام ہے لیکن یہ ناممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن و حدیث کی بدولت اس زبان کو زندہ رکھنے کے لیے خود سامان مہیا کر دیا ہے۔

پیغمبر ﷺ افصح العرب والعجم ہیں۔ آپ کا کلام فصیح ترین کلام ہے جس کا بہت بڑا ذخیرہ حدیث کی صورت میں محفوظ ہو گیا ہے۔ حدیث کی زبان فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے نہایت بلند ہے۔ اس میں اور قرآن کی زبان میں بس وہی فرق ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے پیغمبر کے کلام میں ہو سکتا ہے۔ آپ کے صحابہؓ خصوصاً خلفائے راشدینؓ کے کلام کی شان بھی بہت بلند ہے۔ قرآن کے طالب علم کو ان تمام چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کے مطالعہ سے اس کو قرآن کی لفظی اور معنوی ہر قسم کی مشکلات حل کرنے میں مدد ملے گی۔

جو شخص قرآن مجید کی زبان کے ایجاز و اعجاز کا اندازہ کرنا چاہے اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ امرؤ القیس، عمرو بن کلثوم، زہیر اور لبید جیسے شعراء اور قس بن ساعدہ جیسے بلند پایہ خطیبوں کے کلام کے محاسن و معایب کے سمجھنے کا ذوق بھی پیدا کرے۔ اس کے بغیر نہ تو کوئی شخص یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن عربی زبان کے محاسن کا کیسا کامل نمونہ ہے اور نہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اندر وہ کیا جادو ہے جس نے تمام فصیحوں اور بلیغوں کو ہمیشہ کے لیے عاجز و درماندہ کر دیا۔ اگرچہ زمانہ جاہلیت کے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کا بڑا حصہ دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا تاہم اتنا ذخیرہ اب بھی موجود ہے کہ اصل مقصد کے لیے کفایت کرتا ہے۔ ادھر شعرائے جاہلیت کے ایسے دواوین شائع ہوئے ہیں جو پہلے ناپید تھے۔ شعراء اور خطباء کے کلاموں کے مجموعے پہلے سے بھی موجود ہیں، اگرچہ ان کے اندر منحول کلام بھی شامل ہے۔ لیکن عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے ان کے خالص اور منحول کلام میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

کلام جاہلیت اور خطبات جاہلیت کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے نہ صرف زبان کا ذوق پیدا ہوتا ہے بلکہ اہل عرب کے معروف و منکر، ان کی معاشرتی زندگی کی خصوصیات، ان کے معاشرے میں خیر و شر کے معیارات، ان کے سماجی، تمدنی اور سیاسی نظریات، روز مرہ کی زندگی میں ان کی دلچسپیاں اور مشاغل، ان کے مذہبی رسوم و اعتقادات غرض اس طرح ساری چیزوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان چیزوں سے صحیح واقفیت اس شخص کے لیے نہایت ضروری ہے جو قرآن کے ارشادات و تلمیحات اور اس کی تعریضات و کنایات کو اچھی طرح سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہو۔

غرض کلامی مسائل ہوں یا فقہی اور اخلاقی، ہر ایک کے غث و سمین میں امتیاز کے لیے کسوٹی قرآن ہے اور قرآن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی زبان کا نہایت اعلیٰ ذوق ہو۔ اگرچہ اس نیش عشق کے گوارا ہونے کے لیے ایک عمر چاہیے لیکن یہ ایک ناگزیر

امر ہے۔اس کو گوارا کیے بغیر قرآن کے علم کی راہ نہیں کھل سکتی۔یہاں پر تنبیہ بھی ضروری ہے کہ اس زمانہ میں تجارتی اور سیاسی مقاصد سے عربی سیکھنے اور سکھانے کا جو چرچا ہو رہا ہے اس سے دوسرے فوائد جو بھی حاصل ہوں وہ حاصل ہو سکتے ہیں لیکن قرآن و حدیث کے علم کے لیے یہ چیز بالکل بے سود ہے۔

۵۔ قرآن قطعی الدلالۃ ہے

فہم قرآن کے لیے ایک اور اصول جس کو ماننا ضروری ہے، یہ ہے کہ "قرآن قطعی الدلالۃ ہے" یعنی قرآن مجید کے الفاظ کے لغوی معانی ان کے مفہوم کی طرف ٹھیک ٹھیک رہنمائی کرتے ہیں۔یہ بات نہیں ہے کہ قرآن مجید نے جو لفظ استعمال کیا ہو وہ اگرچہ ایک خاص معنی دے رہا ہو لیکن قرآن اس کو نظر انداز کر کے مراد اس سے مختلف لے رہا ہو۔ یا قرآن کا بیان بادی النظر میں تو ہر قاری کو کچھ اور معلوم ہو لیکن اصل میں قرآن کا مفہوم اس سے مختلف ہو جو ہر پڑھنے والا اس سے سمجھتا ہے۔اس بحث کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ کچھ غلط فہمیاں لوگوں کے ذہنوں میں اس قدر رچ بس گئی ہیں کہ ان کے مضمرات کی طرف عام طور پر نگاہ نہیں جاتی لیکن اس کے نتیجہ میں قرآن کی حیثیت مجروح ہوتی ہے اور یہ چیز فہم قرآن میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔اس نوعیت کی بعض غلط فہمیاں یہ ہیں :-

۱۔ بعض متکلمین کا نظریہ یہ ہے کہ الفاظ قرآن کی دلالت اپنے معانی پر ظنی ہے جب کہ ان کے زعم میں کلامی مسائل کی بنیاد براہینات پر ہے جو قطعی ہیں۔

۲۔ قرآن مجید چونکہ محکمات و متشابہات کا مجموعہ ہے اور ان دونوں اقسام کی آیات متعین نہیں ہیں۔اس لیے پورے قرآن کی دلالت ان کے خیال میں ظنی ہو گی۔

۳۔ پیغمبر ﷺ کی طرف قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوئی ہے جو اگرچہ تحریر میں نہیں آئی اور اس طرح وہ غیر متلو ہے۔لیکن وہ بھی اسی طرح ہدایت کا ماخذ ہے جس طرح قرآن۔لہٰذا متن قرآن کی دلالت قطعی نہیں رہی۔ ممکن ہے اس کے مفہوم کو کسی غیر متلو وحی نے بدل دیا ہو۔

۴۔ قرآن مجید کی متداول قرأتیں سات یا اس سے بھی زیادہ ہیں اس لیے کسی ایک قرأت کی دلالت قطعی نہیں ہو سکتی۔

ان غلط فہمیوں کی وجہ سے فتنوں کا دروازہ کھل گیا اور قرآن فہمی کی راہ مسدود ہو گئی ہے۔ضرورت ہے کہ ان غلط فہمیوں کو دور کیا جائے تاکہ فتنوں کا سدباب ہو سکے۔

کیا الفاظ کی دلالت ظنی ہے ؟

مسلمانوں کا تعلق جب عجمی قوموں سے ہوا اور ان کے علوم و فنون سے ان کو واسطہ پڑا تو دینی مسائل پر سوچنے کا وہ انداز فکر وجود میں آیا جس کو علم کلام سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس علم نے مسلمانوں کے اندر مختلف مکتب خیال پیدا کیے اور ان میں سے ہر مکتب خیال کے لوگوں نے اپنے مخصوص افکار و نظریات کے مطابق قرآن مجید کی تفسیریں لکھیں اور اپنے مزعومات کو قرآن مجید کی صریح آیات پر فوقیت دینے کی کوشش کی۔اس کی بے شمار مثالیں ہم کو امام رازیؒ کی تفسیر میں مل سکتی ہیں۔وہ بسا اوقات اشاعرہ کے کلامی نظریات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے حدود تفسیر سے اس قدر تجاوز کر جاتے ہیں کہ اگر کوئی آیت ان کو صریحاً مسلک اشاعرہ کے خلاف نظر آتی ہے تو اس کی تردید میں وہ یہ کہہ جانے میں بھی کوئی باک نہیں محسوس کرتے کہ الفاظ قرآن کی دلالت اپنے معانی پر ظنی ہے تو کلامی براہینات کے مقابلے میں ایک ظنی چیز کو کیا اہمیت دی جا سکتی ہے۔امام رازیؒ کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

الدلائل اللفظية لا تكون قاطعة البتة لان كل دليل لفظى فانه موقوف على نقل اللغات و نقل وجوه النحو و التصريف و موقوف على عدم الاشتراك و عدم المجاز و عدم التخصيص و عدم الاضمار و عدم المعارض النقلى و العقلى و كل ذالک

مظنون و الموقوف على المظنون اولى ان يكون مظنونا فثبت ان شيئا من الدلائل اللفظية لا يكون قاطعاً-

(لفظی دلائل ہرگز قطعی نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر دلیل لفظی، لغات اور وجوہ اعراب کے نقل اور عدم اشتراک، عدم مجاز، عدم تخصیص، عدم اضمار اور عدم معارض عقلی و نقلی پر مبنی ہے اور ان میں سے ہر چیز ظنی ہے اور جو چیز کسی ظنی چیز پر موقوف ہے وہ بدرجہ اولیٰ ظنی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ لفظی دلائل ہرگز قطعی نہیں ہو سکتے۔)

اس طرح کی باتیں لکھنے کی ضرورت امام رازیؒ کو اس لیے پیش آئی کہ انہیں کچھ الفاظ کے معانی اپنی ہر بانیات سے متصادم نظر آئے۔ اس پر انہوں نے یہ اصول گھڑ لیا کہ الفاظ کی دلالت ان کے معانی پر ظنی ہے اور ظنی اور کمزور دلائل کی بنا پر کچھ کہنا جائز نہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں :-

فاذا كانت المسئلة قطعية يقينية كان القول فيها بالدلائل الظنية الضعيفة غير جائز مثاله قال الله تعالى لا يكلف الله نفسا الا وسعها- قام الدليل القاطع على ان مثل هذا التكليف قد وجد على ما بينا بالبراهين الخمسة فى تفسير هذه الاية فعلمنا ان مراد الله تعالىٰ ليس ما يدل عليه ظاهر هذه الاية

(جب کہ ایک مسئلہ اپنی جگہ پر قطعی اور یقینی ہو تو اس کے بارے میں ظنی اور کمزور دلائل کی بنا پر کچھ کہنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا) کے متعلق قطعی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس قسم کی تکلیف مالایطاق اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیتا ہے۔ ہم اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں اس کی تائید میں پانچ نہایت محکم دلیلیں لکھ چکے ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد وہ نہیں ہو سکتی جو ظاہر آیت سے معلوم ہوتی ہے۔)

الفاظ قرآن کی دلالت کو ظنی قرار دینے کی دوسری وجہ یہ بھی ہوئی کہ چند نادر الفاظ کے معنی متعین کرنے میں کچھ اختلاف ہوا جس کو اہل تاویل رفع نہ کر سکے۔ مثلاً لفظ "قروء" کے معنی ایک گروہ کے نزدیک "طہر" کے ہیں اور دوسرے کے نزدیک 'حیض' کے۔ ہر گروہ کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں۔ اس اختلاف سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اس لفظ کی دلالت اپنے معنی پر قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے۔ اس طرح کے اختلافات کی بنا پر بعض لوگوں نے یہ اصول وضع کر دیا کہ قرآن مجید کے الفاظ کی دلالت اپنے معانی پر ظنی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بدترین قسم کی سوفسطائیت ہے۔ انسان کی آنکھ اگر کبھی دھوکا کھا جاتی ہے تو اس سے یہ اصول نہیں بنایا جا سکتا کہ آنکھ دھوکا دینے ہی کے لیے بنی ہے۔ عقل انسان کو سوچنے کے لیے دی گئی ہے۔ اس کے کبھی کبھار ٹھوکر کھا جانے کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ وہ ٹھوکر کھلانے کے لیے دی گئی ہے۔ اسی طرح کسی لفظ کے معنی میں اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اس اختلاف کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زبان کے سارے الفاظ کی دلالت اپنے معانی پر ظنی ہے۔

بعض الفاظ کے معانی میں اختلاف ہر زبان میں ہوتا ہے۔ یہ اختلافات طے کرنے کے لیے اصول بنے ہوئے ہیں۔ اہل زبان ان اصولوں کی روشنی میں یہ اختلاف طے کر لیتے ہیں۔ مثلاً اردو کے کسی لفظ کے معنی میں اختلاف ہو گا تو ہم یہ دیکھیں گے کہ دلی کی زبان میں یہ لفظ کس معنی میں بولا گیا، غالب یا داغ نے اس کو کس مفہوم میں استعمال کیا اور اگر دلی اور لکھنؤ کا اختلاف ہو گا تو دیکھیں گے کہ دلی میں کس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور لکھنؤ کے معتبر ادیبوں کے ہاں وہ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرح سے لفظ کے صحیح معنی متعین ہو جاتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر ہمیں عربی کے کسی لفظ کے بارے میں مشکل پیش آتی ہے تو ہم "لسان العرب" دیکھتے ہیں۔ اگر اس میں اہل لغت مختلف ہوتے ہیں تو اس کے شواہد پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ قریش کی ٹکسالی زبان میں اس کا کیا مفہوم ہے۔ امرؤالقیس نے

اسے کیسے استعمال کیا ہے۔ زہیر نے کیا معنی لیے ہیں۔ دوسرے مستند شعراء کے ہاں وہ کس طرح استعمال ہوا ہے؟ پھر جس معنی کی تائید میں دلائل پاتے ہیں اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اگر قرآن مجید میں اس کی نظیر مل جائے تب تو کسی اور دلیل کی حاجت ہی نہیں رہتی کیونکہ اس سے بڑی کوئی دلیل نہیں۔ قرآن اعلیٰ عربی ادب کا سب سے مستند ماخذ ہے۔

کوئی زبان ایسی نہیں ہو سکتی جس کے الفاظ کی دلالت اس کے معانی پر ظنی ہو۔ اگر زبان کی دلالت غیر معتمد قرار دے دی جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس زبان میں ساری دستاویزیں اور سارے قوانین و معاہدات بالکل بے معنی ہیں۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں کی طرف کتاب مبین کی شکل میں ایک صحیفہ رشد و ہدایت بن کر نازل ہوا ہے۔ اس کے متعلق یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے الفاظ کی دلالت اس کے معانی پر ظنی ہے۔ ان لوگوں کی عقلوں پر افسوس ہے جنھوں نے یہ سنگین بات کہی اور اس کے نتائج پر انھوں نے غور نہیں کیا۔

محکمات اور متشابہات واضح ہیں

اہل تشکیک نے قرآن مجید کی آیہ "هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ......" سے یہ استدلال کیا ہے کہ قرآن مجید میں چونکہ محکمات اور متشابہات دونوں ہیں اور متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے تو یہ کیسے معلوم ہو کہ کون سی آیت محکم اور کون سی متشابہ ہے؟ پھر ایک قدم اور آگے بڑھ کر انھوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ جب محکم و متشابہ متعین نہیں ہیں تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ پورا قرآن غیر محکم ہے۔ یہ محکم اور متشابہ کا فتنہ کوئی معمولی فتنہ نہیں ہے۔ مسلمانوں میں جب کلامی و فقہی بحثوں کا زور ہوا تو ہر فرقہ نے اس حربہ کو اپنے حریف کے مقابل میں استعمال کیا اور ہر اس آیت کو اس نے متشابہ قرار دے دیا جو اس کو اپنے مدعا کے خلاف اور حریف کے مقصد کے موافق نظر آئی۔ حالانکہ قرآن مجید

میں محکم اور متشابہ دونوں واضح ہیں۔ آیات محکمات سے مراد قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جو آفاق و انفس کی بدیہیات، خیر و شر کے مسلمات اور معروف و منکر کے قطعیات اور یقینیات پر مشتمل ہیں، جن کو دل قبول کرتے ہیں اور جن کو قبول کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی شرط نہیں ہے کہ دل سلیم ہو، جن کے حق ہونے پر عقل گواہی دیتی ہے بشرطیکہ اس پر تعصب، جذبات اور غیر فطری عقلیات کے پردے نہ پڑے ہوں۔ یہی آیات ہیں جن کی حیثیت ام الکتاب کی ہے یعنی بقیہ ساری کتاب کا مرجع و مرکز وہی محکمات ہیں۔ انھیں پر ساری بحث کا مدار ہوتا ہے۔ ساری شاخیں انھی سے پھوٹتی ہیں۔ اگر کوئی نزاع و اختلاف پیدا ہو تو اس کا فیصلہ بھی انھی کی کسوٹی پر پرکھ کر ہوتا ہے۔ انھی کو اصول قرار دے کر ان سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ ان کے مقابل میں متشابہات سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں ہمارے مشاہدات و معلومات کے دسترس سے باہر کی کوئی بات تمثیلی اور تشبیہی رنگ میں قرآن نے بتائی ہیں۔ یہ باتیں جس بنیادی حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں وہ جائے خود واضح اور مبرہن ہوتی ہے۔ عقل اس کے اتنے حصے کو سمجھ سکتی ہے جتنا سمجھنا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ البتہ چونکہ ان کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن ان کو تمثیل و تشبیہ کے انداز میں پیش کرتا ہے، تاکہ علم کے طالب بقدر استعداد ان سے فائدہ اٹھالیں اور اصل صورت و حقیقت کو علم الٰہی کے حوالہ کریں۔ ان کا تعلق عقائد و شرائع سے یا اللہ تعالیٰ کے قوانین و سنن سے یا مسلمات فطرت اور مسلمات عقل سے نہیں ہوتا بلکہ محض جنت اور دوزخ کے بعض احوال اور لذات و آلام سے ہوتا ہے۔ ان کا جس حد تک سمجھنا ضروری ہے اتنا ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور اس سے ہمارے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اگر ان کا کوئی پہلو سمجھ میں نہیں آتا تو اس کے نہ سمجھنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

متشابہات کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں بلکہ بہت محدود ہے۔ مثلاً جن چیزوں کو قرآن مجید نے متشابہ کہا ہے ان کو ایک مثال سے سمجھئے۔ دوزخ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے

"علیہا تسعة عشر" (اس کے اوپر انیس سرہنگ مقرر ہیں) یا مثلاً دوزخ کے شجر ملعونہ (زقوم) کو متشابہ کہا ہے۔ یہ قیامت کی جزئیات میں سے بعض ایسی باتیں ہیں جو ہمیں سمجھانے کے لیے ہماری زبان میں بتائی گئی ہیں۔ ان کی اصل حقیقت کیا ہے، یہ چیز ہم یہاں نہیں جان سکتے ان کی حقیقت صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ جہاں تک قیامت کا معاملہ ہے وہ متشابہ نہیں۔ البتہ اس کی تفصیلات میں سے بعض جزئی چیزیں ہیں جنہیں متشابہات کہا گیا ہے۔ ان کی حقیقت اگر آپ کو معلوم نہ ہو تو اس سے قیامت کے عقیدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ فرض کیا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جو انیس سرہنگ ہوں گے وہ کس قوت و طاقت کے مالک ہوں گے؟ ان کی شکل و صورت کیا ہوگی یا وہ کون سا لباس پہنیں گے، تو کیا ان جزئیات کے نہ سمجھنے سے جزا و سزا کا معاملہ مشتبہ ہو جائے گا؟ اساسات دین سے ان کا کیا تعلق! اور یہ کون سی عقلمندی کی بات ہوگی کہ آدمی چند جزئی باتوں کے نہ سمجھ سکنے کے سبب سے اپنے اس سارے ذخیرہ علم کو اٹھا پھینکے جو اس کے نزدیک ثابت شدہ ہے اور جس پر اس کی عقل اور فطرت گواہ ہے۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو ہم پلہ نہیں ہیں

اصولیین یعنی اہل فقہ کہتے ہیں کہ وحی صرف اتنی ہی نہیں جتنی قرآن میں ہے بلکہ ان کے علاوہ بھی آنحضرت ﷺ پر وحی نازل ہوئی ہے، جس کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔ اس سے بعض کم فہم لوگ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ چونکہ وحی متلو اور غیر متلو میں امتیاز مشکل ہے اس وجہ سے یہ چیز قرآن کی قطعیت میں قادح ہے۔ لیکن یہ محض جہالت پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن مجید کے علاوہ بھی نبی ﷺ پر وحی نازل ہوئی جس کو وحی غیر متلو کہتے ہیں لیکن اس وحی کا قرآن مجید سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن سے تعلق صرف وحی متلو کو ہے جس کی تلاوت، تذکیر اور حفاظت و صیانت پر نبی ﷺ مامور تھے۔ اسی کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی اور جب یہ دعا پوری ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے عربوں پر اس کا احسان

جتایا۔

هُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ ۲)

(وہی ہے جس نے امیوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے)

آنحضرت ﷺ کی یہ منصبی ذمہ داری تھی کہ آپ اس وحی کی تبلیغ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ آپ کو تنبیہ کی گئی کہ اگر آپ نے اس تبلیغ میں کوئی کسر اٹھا رکھی تو گویا فرض رسالت ادا نہیں کیا۔ فرمایا:-

یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ- وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ- وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ- اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ- (المائدہ، ۶۷)

(اے رسول، تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور اللہ لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ اللہ کافروں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرے گا)

اس وحی کی تبلیغ ہی آنحضرت ﷺ کے مشن کا اصل کام تھا۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اے لوگو! گواہ رہو کہ میں نے اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا"۔ اس وحی کے حرف حرف کو رسول اکرم ﷺ نے اس طرح سنایا جیسا اس کے سنانے کا حق تھا۔ اس کو حضورؐ نے اپنی نگرانی میں مدون بھی کرا دیا اور یہ بعینہٖ بین الدفتین بسم اللہ سے لے کر والناس تک قرآن مجید کی صورت میں محفوظ ہے اور امت مسلمہ اس کی امین بنائی گئی ہے۔

قرآن مجید کے علاوہ جو وحی غیر متلو ہے اس کی تفصیل سے ہم آگاہ نہیں کیے گئے۔

اس وجہ سے ہم پر اس کی ذمہ داری بھی نہیں ڈالی گئی۔ اگر کوئی قول اس سلسلہ میں رسول اکرم ﷺ سے منسوب کیا جائے گا تو ہم اس کی تحقیق کریں گے۔ اس کو روایت کے اصولوں پر جانچیں گے، درایت کے اصولوں پر پرکھیں گے۔ قرآن سے اس کی مطابقت اور مخالفت دیکھیں گے۔ ان تمام کسوٹیوں پر پرکھنے کے بعد جب اطمینان ہو جائے گا تب اس کو وہ درجہ دیں گے جو دین میں اس کا ہو گا۔

وحی متلو وہی ہے جو قرآن مجید کی صورت میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ وحی متلو ایک حرف بھی نہیں ہے۔ اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کے بارے میں ہمیں کسی قسم کا تردد ہو۔ اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہے اور اس کا کوئی نقطہ تک غائب نہیں۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ انّ علینا جمعہٗ و قرآنہٗ (اور ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا)

قرأتوں کا اختلاف

بعض لوگ قرآن کی قرأتوں کو بھی قرآن کی دلالت کے قطعی ہونے میں قادح سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس اختلاف قرأت کے مسئلہ پر بھی لوگوں نے صحیح نہج سے غور نہیں کیا۔ اس وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ قرآن مجید کی سات قرأتیں ہیں۔ یہ غلط فہمی غالباً اس حدیث سے پیدا ہوئی جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ "انزل القرآن علی سبعۃ احرف" (قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا) سات حرفوں کے معنی اگر یہ لیے جائیں کہ قرآن کے تمام الفاظ سات طریقوں سے پڑھے جا سکتے ہیں تو اس صورت میں قرآن ایک معمہ بن کر رہ جائے گا۔ لیکن جو لوگ قرأتوں کے اختلاف کو بڑی اہمیت دیتے ہیں وہ بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ قرآن کے کسی لفظ کی قرأت سات طریقوں سے کی گئی ہے۔ ابن جریرؒ قرأتوں کے اختلاف نقل کرنے میں بڑے فیاض واقع ہوئے ہیں۔ لیکن انہوں نے بھی کسی لفظ کی دو تین سے زیادہ قرأتیں شاید ہی نقل کی

ہوں۔

"سبعۃ احرف" سے کیا مراد ہے، اس میں علمائے فن کا اختلاف ہے۔ اس کے متعلق چالیس سے زیادہ اقوال ہیں جن میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ متشابہات میں سے ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ اس قدر اختلاف کی موجودگی میں "سبعۃ احرف" سے سات قرأتیں مراد لینا اور اس پر اصرار کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟ پھر یہ بات بھی یاد رکھیے کہ بعض علماء سات کے عدد کو متعین سات کے معنی میں نہیں بلکہ کثرت کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک قرأتیں دراصل دس ہیں۔

غور کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قرأتوں کا اختلاف دراصل قرأتوں کا اختلاف نہیں، بلکہ اکثر و بیشتر تاویل کا اختلاف ہے۔ کسی صاحب تاویل نے ایک لفظ کی تاویل کسی دوسرے لفظ سے کی اور اس کو قرأت کا اختلاف سمجھ لیا گیا حالانکہ وہ قرأتوں کا اختلاف نہیں بلکہ تاویل کا اختلاف ہے۔ مثلاً سورہ تحریم میں بعض لوگوں نے "فقد صغت" کو "فقد زاغت" بھی پڑھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس نے بھی یہ پڑھا ہے اس نے یہ قرأت نہیں بتائی، بلکہ اپنے نزدیک اس نے "فقد صغت" کی تاویل کی ہے لیکن لوگوں نے اس کو بھی قرأت سمجھ لیا۔

ہمارے نزدیک قرأتوں کے اختلاف کو خلیفہ راشد سیدنا عثمان غنیؓ نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا اور انہوں نے یہ عظیم کارنامہ تمام صحابہؓ کے اتفاق رائے سے انجام دیا۔ اس وجہ سے اس کو اجماع کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بعد اس کے باقی رہنے کے لیے کوئی جواز نہیں ہے۔

سیدنا عثمانؓ کے دور خلافت میں جب یہ معلوم ہوا کہ مملکت کے بعض شہروں میں قرآن کے بعض الفاظ کی قرأت مختلف طریقوں سے ہوتی ہے تو آپؓ نے قرآن کے تمام اصحاب علم صحابہ کرام کو جمع کر کے ان کے سامنے تمام مختلف فیہ الفاظ کو رکھا اور ایک ایک پر

حث کر کے اتفاق رائے سے لوگوں کو اس قرأت پر جمع کر دیا جو قریش کی قرأت تھی۔ اس لیے کہ یہ بات نص قرآن سے ثابت ہے کہ قرآن قریش کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پھر اس قرأت کے مطابق قرآن کے نسخے لکھوا کر مختلف شہروں میں بھجوا دیے گئے کہ لوگ اس قرأت کی پیروی کریں۔ ہمارے ہاتھوں میں جو مصحف ہے وہ اسی قرأت پر ہے۔ اس قرأت کو قرأت حفص کہتے ہیں۔ متواتر قرأت صرف یہی ہے جس پر خلیفہ راشدؓ کی قیادت میں امت کا اجماع ہوا ہے۔ اس کے مقابل میں دوسری قرأتوں کی حیثیت شاذ قرأتوں کی ہے جس کی متواتر قرأت کے مقابل میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

نسخ اور اس کی حکمت

نسخ کی حقیقت کیا ہے؟ فہم قرآن کے ضمن میں یہ ایک مشکل سوال ہے۔ اس لیے اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس مسئلہ کو جس طرح عموماً بیان کیا جاتا ہے اس سے شبہ ہوتا ہے کہ خدانخواستہ قرآن کا قطعی الدلالہ ہونا کوئی واضح چیز نہیں ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن میں ناسخ و منسوخ دونوں اتنی قطعی اور واضح شکل میں موجود ہیں کہ ان کے متعلق کسی تردد کا امکان نہیں۔ ہم اس مسئلہ کے اہم پہلوؤں پر یہاں روشنی ڈالیں گے۔

نسخ کا مفہوم:

"نسخ" کے اصل معنی ہٹانے اور مٹانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

فَیَنسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ۔ (الحج، ۵۲)

(پس اللہ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جو شیطان داخل کر دیتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کو محکم کرتا ہے۔)

نسخ کا لفظ جو اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد ایک قانون کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا قانون لانا ہوتا ہے۔ سورہ بقرہ اسلامی قانون کی سب سے بڑی سورہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلامی شریعت کے احکام نازل ہوئے اور اہل کتاب نے محسوس کیا کہ ان کی شریعت کے بعض احکام کو اسلام نے بدل دیا ہے تو ایک اعتراض جو اہل کتاب کی طرف سے قرآن پر اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ قرآن جب ہماری کتابوں کو آسمانی تسلیم کرتا ہے تو اس کی تعلیمات کو منسوخ کیوں کرتا ہے۔ قرآن نے ان کے اعتراض

کا جواب یہ دیا :-

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا- اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ- (البقرہ،۱۰۶)

(جو کوئی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظر انداز کراتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کی مانند دوسری لاتے ہیں- کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے-)

سابق شریعتوں کے نسخ کی حکمت :

قرآن مجید نے اہل کتاب کو جو جواب دیا اس پر تدبر کرنے سے دو پہلو واضح طور پر سامنے آتے ہیں :-

ایک تو یہ کہ نسخ خوب سے خوب تر کی طرف عروج اور ترقی کے نقطہ نظر سے ہے- یہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جو اس نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے فرمایا تھا کہ وہ اپنا آخری نبی بھیجے گا جو اللہ کی شریعت کو کامل کرے گا، تمام طیبات کو حلال کرے گا، تمام خبائث کو حرام ٹھہرائے گا اور لوگوں کو ان پابندیوں سے آزاد کرے گا، جو اس وقت ان پر ہیں-

جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ نسخ تجدید و احیائے دین کے تقاضے کے تحت ہے- یہود و نصاریٰ کو جو شریعت ملی تھی اس کے کچھ حصہ کو انہوں نے فراموش کر دیا تھا- اس فراموش کردہ حصہ میں سے جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے ضروری ٹھہرایا اس دین کامل کے ذریعہ سے اس کی تجدید فرما دی تاکہ دین کے خزانہ سے جو دولت پاسبانوں کی غفلت اور نالائقی کے سبب سے ضائع ہو گئی تھی، وہ از سر نو محفوظ ہو جائے، اور اس کے کسی حصہ کو باقی رکھنے کی اگر ضرورت نہیں رہی تو اس حصہ کو نظر انداز کر دیا اور اس کی جگہ اس کے ہم پایہ و ہم مرتبہ دوسرے احکام عنایت فرمائے-

تکمیل دین اور تجدید شریعت کے علاوہ نسخ کی ضرورت ایک تیسرے پہلو سے بھی

ہے- یہ پہلو دین و شریعت کی تطہیر کا پہلو ہے- یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی شریعت کو ان بدعتوں اور ملاوٹوں سے پاک کرنا، جو اہل بدعت اور خواہش پرستوں نے اس میں ملا دی ہوں- اس کا ذکر سورہ حج کی اس آیت میں ہوا ہے، جس کا حوالہ ہم اوپر دے چکے ہیں- فرمایا ہے فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ- (پس اللہ تعالیٰ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جو شیطان داخل کر دیتا ہے پھر اللہ اپنی آیتوں کو محکم کرتا ہے)

قرآن میں دین کا جو فلسفہ بیان ہوا ہے اس کے مطابق شروع سے آخر تک اللہ تعالیٰ کا دین بنیادی طور پر ایک ہی رہا ہے اور اسی کی دعوت انبیاء کرام نے دی ہے- البتہ حالات کے اعتبار سے بتدریج اس میں ترقی ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی شریعت ترقی کرتی ہوئی اس نقطہ کمال تک پہنچی ہے جس نقطہ کمال پر وہ قرآن حکیم میں نظر آتی ہے- اس تدریجی ترقی کے لیے جو چیز مقتضی ہوئی وہ انسان کی فطرت ہے- اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ تدریجی تربیت ہی کے ذریعہ سے اس مقام تک پہنچ سکتا تھا، جس مقام پر پہنچ کر وہ خدا کے دین کامل کا اہل بن سکا ہے- اس مقام پر پہنچنے سے پہلے تک اس کو جو دین ملا وہ بنیادی طور پر تھا تو اسلام ہی لیکن اپنی ظاہری شکل و صورت یا بالفاظ دیگر اپنی شریعت کے اعتبار سے بہت کچھ انہی سانچوں میں ڈھلا ہوا تھا، جو اس کے عہد کے ذہنی، عقلی اور اجتماعی و تمدنی تقاضوں سے مناسبت رکھتے تھے- تدریجی تربیت کے ذریعے سے جب اس کی فطرت کے تمام مضمرات واضح ہو گئے اور اس کی عقل بلوغ کو پہنچ گئی تب اللہ تعالیٰ نے اس کو اسلام، اس شکل و صورت اور اس شریعت کے لباس میں دیا، جو ٹھیک ٹھیک اس کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے- کوئی چیز نہ اس سے کم ہے نہ اس سے زیادہ- یہ ترقی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ پچھلی شریعتوں کی بہت سی چیزیں بدلیں اور اسلام میں وہ اپنی ان شکلوں میں نمودار ہوں جو ان کی بالکل معیاری اور فطری شکلیں ہیں-

قرآن میں نسخ کی نوعیت :

قرآن مجید کے ذریعہ سے سابق آسمانی صحائف کے نسخ پر فی الجملہ مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ جس مسئلہ میں آراء مختلف ہیں وہ خود قرآن کے اپنے احکام کا نسخ ہے اور اسی مسئلہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی شریعت میں نسخ کے بارے میں ہمارے ہاں تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ اس کا یک قلم منکر ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو نہ صرف نسخ کے قائل ہیں بلکہ اس کو بہت زیادہ وسعت دیتے ہیں۔ تیسرا گروہ اس کا قائل تو ہے لیکن اس کو صرف چند احکام تک محدود مانتا ہے۔

جو گروہ نسخ کا یک قلم منکر ہے اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے احکام حالات کے تابع ہیں۔ جو احکام منسوخ ہوئے وہ صرف اس وجہ سے منسوخ ہوئے کہ جن حالات کے اندر وہ نازل ہوئے تھے وہ حالات تبدیل ہو گئے۔ اب اگر وہی حالات پلٹ آئیں تو وہ احکام بھی از سر نو بحال ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے جو احکام بظاہر منسوخ ہیں، وہ فی الحقیقت منسوخ نہیں بلکہ اپنے مخصوص حالات کے اندر بدستور قائم و زندہ ہیں۔

اس مسلک میں متعدد غلطیاں ہیں، جن کے استقصاء کا یہاں محل نہیں۔ چونکہ اس مسلک کے ماننے والے اس وقت موجود بھی نہیں ہیں اس لیے ان پر تنقید کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ البتہ ایک بات جو فتنے کا باعث بن سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر حالات کی تبدیلی کے بہانے شریعت کے منسوخات کی طرف پلٹنے کے جواز کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے فتنہ پسند طبائع کے لیے شریعت سے فرار کی ایک ایسی راہ کھل جاتی ہے جس کا بند کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس زمانے میں بڑی آسانی کے ساتھ، اس دلیل کے سہارے روزہ، نماز، حرمت شراب اور حد زنا وغیرہ کے بارے میں سہولت پسند لوگ اجتہاد شروع کر دیں گے اور دین کے معاملہ میں امان ہی اٹھ جائے گی۔

دوسرے گروہ نے نسخ کے دائرے کو جو بہت زیادہ وسعت دی ہے تو اس کی وجہ یہ

ہے کہ اس کے نزدیک نسخ کا ایک خاص مفہوم ہے۔ یہ لوگ تخصیص اور تقیید کو بھی نسخ کا درجہ دے دیتے ہیں۔ تخصیص اور تقیید دو اصطلاحیں ہیں۔ 'تخصیص' سے مراد عام کو خاص کر دینا ہوتا ہے اور 'تقیید' کے معنی آیت میں لگی ہوئی قید کو اٹھا دینا یا کسی آیت میں قید بڑھا دینا ہے۔ عام اہل اصول اس بات پر متفق ہیں کہ تخصیص اور تقیید کے تمام قرائن عقل عام کے اندر یا شریعت و دین کے اندر پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اگر باہر کی کوئی چیز اس کی اساس فراہم کرے گی تو وہ ناسخ ہو گی۔ مخصص یا مقید نہیں ہو سکتی۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنے کی سزا پر فقہاء بہت سی قیدیں لگا دیتے ہیں کہ مجرم عاقل اور بالغ ہو، چوری مال محروس کی ہو، مال کی مقدار اتنی ہو کہ اس پر چوری کا اطلاق ہو سکے تو ان قیدوں کا تعلق عقل عام سے ہے۔ مجنون اور فاتر العقل قطع ید کی سزا سے مستثنیٰ ہیں تو یہ شریعت کے معروف کے مطابق ہے۔ اسی طرح الفاظ کے اندر بھی قرینہ موجود ہے۔ مثلاً 'سارق' (چور) اور 'مَنْ سَرَقَ' (جس شخص نے چوری کی) میں فرق واضح ہے، چنانچہ اگر کوئی راہ چلتے کچھ پھل توڑ لیتا ہے تو اس کو 'سارق' گردان کر اس کو قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی بلکہ وہ 'مَنْ سَرَقَ' ہونے کے باعث اس سرزنش کا مستحق ہو گا۔ ایک حکم میں اگر دوسرے حکم کے ذریعہ سے ترمیم کر دی گئی یا حکم ہی تبدیل کر دیا گیا یا ایک حکم کے بجائے بالکل دوسرا حکم دے دیا گیا تو یہ حکم ناسخ ہو گا، مخصص یا مقید نہیں ہو گا۔ مخصص اور مقید کا یہ درجہ نہیں ہوتا۔

یہاں ایک بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ مخصص کا حکم اصل حکم سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اصل حکم اگر سو کوڑے مارنے کا ہے تو مخصص رجم کا حکم نہیں دے سکتا۔ مخصص کا مفہوم تو یہ ہے کہ وہ کسی حکم کو کسی خاص دائرے میں مخصوص کر دے نہ کہ اس کو کسی بڑے حکم سے بدل دے۔

تیسرا مسلک یہ ہے کہ قرآن میں کچھ آیات منسوخ ہیں اور ناسخ اور منسوخ دونوں اس کے اندر موجود ہیں۔ ہمارے نزدیک یہی مسلک صحیح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کا

منسوخ ہونا صرف اس وقت ثابت ہوگا جب اس کا ناسخ قرآن میں موجود ہوگا، اگر قرآن میں ناسخ موجود نہیں تو اس کے منسوخ ہونے کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ قرآن سے بڑی کوئی چیز نہیں جو اس پر حاکم ہو سکے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ناسخ اور منسوخ دونوں قرآن میں موجود ہوں، ایک ساتھ ہوں یا فاصلے پر ہوں، ایک سورۃ میں ہوں یا قرآن کے مختلف حصوں میں ہوں لیکن واضح طریقہ سے معلوم ہونا ضروری ہے کہ یہ ناسخ ہے اور یہ منسوخ ہے۔ اب فرض کر لیجیے کہ کسی چیز کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ قرآن کے فلاں حکم کی ناسخ ہے، تو اس کو قرآن میں موجود ہونا چاہیے، اگر کہا جائے کہ وہ قرآن میں اس لیے موجود نہیں کہ وہ منسوخ التلاوۃ ہے تو یہ ایک مہمل بات ہوگی۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

کیا حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے؟

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی حدیث قرآن کے حکم کو منسوخ کر سکتی ہے؟ اگرچہ بعض فقہاء مانتے ہیں کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے مگر اس دعویٰ کی کوئی بنیاد نہیں۔ حدیث تو در کنار خود رسول اللہ ﷺ قرآن کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر آپ کو قرآن کی تنسیخ کا اختیار ہوتا تو آپ کی زبان سے یہ کیوں کہلوایا جاتا:۔

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ - (یونس، ۱۵)

(کہہ دو مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنے جی سے ترمیم کر دوں، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔)

اہل علم جانتے ہیں کہ حدیث میں شبہ کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں جن کا ذکر اپنے محل میں ہو چکا ہے۔ لیکن پیغمبر جو معصوم ہوتا ہے اگر وہ قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتا تو اس سے منسوب حدیث کیونکر ایسا کر سکتی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا کہ کیا حدیث قرآن پر

حاکم ہو سکتی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ معاذاللہ میں یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں؟ حدیث قرآن کی مفسر تو ہو سکتی ہے اس کے اوپر حاکم نہیں ہو سکتی۔

نسخ کا دائرہ اور اس کی ضرورت

قرآن مجید کے اندر نسخ کا تعلق تمام تر احکام و قوانین سے ہے، عقائد و ایمانیات یا اخلاق و صفات یا واقعات و حقائق سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ عقائد و ایمانیات اور واقعات و حقائق ایسی چیزیں نہیں ہیں جو آج کچھ ہوں اور کل کچھ اور بن جائیں۔ لیکن احکام و قوانین میں اگر کوئی ترمیم و اصلاح خود قانون دینے والا کر دے تو اس سے قانون کے مقصد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ اس سے اصل مقصد کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

احکام میں نسخ کی ضرورت اس وجہ سے پیش نہیں آئی کہ نعوذباللہ، اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی نقص ہے جس کے سبب سے اس کے نازل کیے ہوئے قانون کو تجربات اور آزمائشوں کے مراحل سے گزرنا پڑا بلکہ اس کی وجہ صرف بندوں کی بعض فطری خامیاں اور کمزوریاں ہیں جن کے سبب سے وہ بسا اوقات کسی قانون کے قبول کرنے میں تدریج اور تربیت کے محتاج ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے اس وجہ سے اس نے پسند فرمایا کہ وہ اپنے قانون میں اس تدریج اور تربیت کو ملحوظ رکھے۔

نسخ آیات کی علت

قرآن کی جو آیات منسوخ ہوئی ہیں وہ کون کون سی ہیں، وہ کن آیات سے منسوخ ہوئی ہیں اور ان کے منسوخ ہونے کی علت کیا ہے؟ اس کا تعلق تفسیر سے ہے اس لیے یہاں تفصیلاً بیان کرنے کا موقع نہیں البتہ جن اصول کے تحت نسخ ہوا ان کا بیان کر دینا ضروری ہے۔ قرآن کے تمام منسوخات پر غور کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ نسخ مختلف تقاضوں کے تحت مختلف صورتوں میں عمل میں آیا۔

بعض صورتوں میں معاشرہ کے ابتدائی حالات کی مناسبت سے کسی باب خاص میں

کوئی عارضی حکم دیا گیا- جب معاشرہ بلوغ کو پہنچ گیا تو اس عارضی حکم کو آخری اور کامل حکم سے بدل دیا گیا- مثلاً ابتداء میں ورثاء کے حقوق کے تحفظ کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا- بدکاری کے سدباب کے لیے ابتداءً پنچایتی قسم کی تعزیر کی ہدایت کی گئی، انصار و مہاجرین کی اخوت کو اخلاقی اخوت سے بڑھا کر قانونی اخوت کا درجہ دیا گیا، لیکن بعد میں جب معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ کی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تو وراثت کے آخری اور حتمی قانون، اور زنا کی معین اور قطعی حد نے ان عارضی قوانین کو منسوخ کر کے خود ان کی جگہ لے لی-

بعض تبدیلیاں انسانی فطرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تدریج کے ساتھ ہوئی ہیں- مثلاً روزے اور حرمت شراب کے احکام کے نفاذ میں تدریج تھی تاکہ لوگوں کی عادت میں تبدیلی لانے کے بعد آخری حکم دیا جائے جس پر عمل ان کے لیے سہل ہو سکے-

بعض احکام کسی عارضی فتنے کے سدباب کے لیے دیئے گئے، مثلاً نبی ﷺ کے ساتھ ملاقات پر کوئی پابندی نہ تھی، جو شخص چاہتا آپ سے مجلس میں یا الگ بات کر لیتا- ایک دور میں منافقین کی ریشہ دوانیاں بہت بڑھ گئیں اور وہ اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے نبی ﷺ سے تخلیہ میں ملنے کا مطالبہ کرتے کہ انہیں کوئی راز کی بات کرنی ہے- اس حرکت سے فتنے برپا ہونے کا امکان تھا- چنانچہ حکم دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی کو رازدارانہ بات کرنی ہو تو وہ پہلے صدقہ کرے، بعد میں جب سرگوشیوں کا رجحان کم ہو گیا تو یہ حکم منسوخ ہو گیا-

بعض اوقات جماعتی مصلحت احکام میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے، مثلاً مسلمانوں کی تعداد کم اور روحانی قوت زیادہ تھی تو ایک مسلمان کو میدان جہاد میں دس کفار کا مدمقابل قرار دیا گیا یعنی اس پر یہ ذمہ داری عاید کی گئی کہ اگر اسے دس کافروں سے بھی مقابلہ کرنا پڑے تو وہ پیچھے نہ ہٹے، بعد میں جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی اور ان میں وہ پہلی سی اخلاقی اور روحانی قوت باقی نہ رہی، تو اس ذمہ داری میں تخفیف کر دی گئی اور ایک مسلمان کو دو کافروں کا مقابل قرار دیا گیا-

آنحضرت ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جن معاملات میں آپ کے سامنے سنت اور ابی کے تحت کوئی واضح ہدایت موجود نہیں ہوتی تھی تو آپ اہل کتاب کا طریقہ اختیار فرما لیتے تھے- کسی معاملہ میں اس طرح کی کوئی چیز آپ نے اختیار فرمائی تو اسی حکم کے اوپر آپؐ کے ساتھ مسلمانوں کو بھی عمل کے لیے چھوڑ دیا گیا حتی کہ ایک وقت آیا جب اسلامی شریعت کا اپنا واضح حکم نازل ہوا اور سابقہ عمل منسوخ ہو گیا- تحویل قبلہ کے معاملہ میں یہی ہوا- بیت اللہ شریف کو قبلہ قرار دینے میں جو تاخیر کی گئی اس میں یہ حکمت بھی مضمر تھی کہ مسلمانوں کا امتحان ہو اور متعین کیا جائے کہ کون رسول کی وفاداری میں پختہ ہیں اور کون لکیر کے فقیر ہیں-

ان کلیات کے تحت تقریباً وہ سارے احکام آ جاتے ہیں جو قرآن میں ناسخ و منسوخ کی نوعیت کے ہیں، یہ سب کے سب مصلحت عباد اور مصلحت دین پر مبنی ہیں- اس سے اللہ تعالی کے علم کا نقص لازم نہیں آتا بلکہ حقیقت میں اس کے کامل علم کا پتہ چلتا ہے-

حکمت قرآن کے فہم کے لیے اساس

قرآن حکیم کے فلسفے یا اس کے اپنے الفاظ میں اس کی حکمت کو سمجھنے کے لیے جن چند باتوں کا بطور کلیہ اور اصول کے مان لینا، ان کو اچھی طرح سے سمجھ لینا اور ان کی صداقت کا احصاء کر لینا نہایت ضروری ہے، وہ ہیں قرآن کا طرز بیان، اس کی حکمت کے بنیادی ستون اور اس کا طرز استدلال۔ قرآن پر تدبر کے دوران اگر ان باتوں کو مد نظر رکھا جائے تو انشاء اللہ بہت سی مشکلات خود بخود حل ہوتی جائیں گی۔

قرآن کا طرز بیان

قرآن مجید کے بیان میں لوگ ایک تصنیف کا رنگ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ نظر نہیں آتا تو انہیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ قرآن کے طالب علم کو جاننا چاہیے کہ قرآن کا طرز بیان مصنفانہ نہیں ہے۔ مصنف کی تو اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ اس کے سامنے حاضرین و سامعین نہیں ہوتے۔ اس کے ذہن میں جو بات ہوتی ہے اسے ایک خاص ترتیب سے اپنی سمجھ بوجھ اور اپنی پسند کے اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ اس سے ہماری مراد عام مصنف نہیں بلکہ ایک اچھا مصنف ہے جو اپنے خیالات کو ایک سائنٹیفک انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن اپنے فلسفہ کو پیش کرتا ہے اور اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ لوگ اس کو سمجھیں اور ان کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو۔ قرآن کا مقصد تعلیم ہے اور ایک معلم کا انداز بیان ایک مصنف کے انداز بیان سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک اچھا استاد اپنے شاگرد

کو سمجھانے کے لیے، منوانے کے لیے، تسلیم کروانے کے لیے، قائل کرنے کے لیے ہر طرح کی جدوجہد کرتا ہے۔ اسی طرح چونکہ قرآن حکیم کا مقصد تعلیم اور تزکیہ ہے اس لیے اس کا طرز بیان مصنفانہ نہیں بلکہ خطیبانہ، واعظانہ اور معلمانہ ہے۔

قرآن کے فلسفہ کے بنیادی ستون

قرآن کے فلسفہ کا پہلا ستون توحید ہے۔ دین کا سارا نظام اسی سے روشن ہے۔ اس کے جسم کی روح اور اس کی آنکھ کی پتلی توحید ہی ہے۔ اس کے بغیر نہ کوئی عقیدہ مؤثر ہے نہ کوئی عمل مثمر۔ یہیں سے دین کا پہلا قدم اٹھتا ہے اور پھر یہیں اس کا آخری قدم پڑتا ہے۔ یہ دین کا دائرہ ہے اور دین اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک اس دائرہ کے اندر ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں جہاں دین فطرت کے احکام و قوانین کی تعلیم دی ہے اس کا آغاز لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (بنی اسرائیل ۲۲) (اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر) سے کیا اور پھر ساری باتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ۔ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ۔ (بنی اسرائیل ۳۹) (یہ ان باتوں میں سے ہے جو تمہارے رب نے حکمت میں سے تمہاری طرف وحی کی ہیں اور خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ کرو) اس سے معلوم ہوا کہ دین کا آغاز اور دین کی انتہا دونوں توحید ہیں اور شرائع و احکام در حقیقت توحید کامل تک رسائی کے لیے وسائل و ذرائع ہیں۔

قرآن کے فلسفہ کا دوسرا ستون رسالت ہے۔ توحید کا اقرار کر لینے کے بعد یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے، اس کے احکام کیا ہیں، اس کی پسند و ناپسند کیا ہے، وہ کیا چاہتا ہے، ہم کس طرح دنیا میں رہیں، ہمارا سیاسی نظام کیا ہو، ہماری معاشرتی زندگی کیسی ہو، حلال و حرام کے پیمانے کیا ہوں، ہماری معیشت کیسی ہو، غرضیکہ زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی پسند و ناپسند اور اس کے احکام کو جاننے کی

ضرورت ہے۔ ان تمام باتوں پر ہماری زندگی کا انحصار ہے۔ یہاں ایک ایسے نظام کی ضرورت پیش آتی ہے جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان رابطہ کا کام دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام نہایت اہتمام سے کیا ہے اور نبوت ورسالت کا ایک مستقل سلسلہ جاری کیا ہے۔ رسالت بھی حقیقت میں توحید ہی کا جزو ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو شارع اور قانون ساز تسلیم کرنا بھی توحید کے مقتضیات میں سے ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام و قوانین اپنے رسول ہی کے ذریعہ سے بھیجتا ہے اس لیے رسول کو زندگی کے ہر شعبہ میں واجب الاطاعت ماننا توحید کا جزو لاینفک ہے۔

قرآن کے فلسفہ کا تیسرا استون معاد یعنی قیامت ہے۔ آسمان وزمین میں خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے جو آثار ودلائل موجود ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے جو اس نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے بنایا ہو، بلکہ ایک قدیر، علیم، حکیم اور رحمان ورحیم ذات کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اگر یہ یونہی چلتی رہے، اس کے اندر جو ظلم ہے اس کے انصاف کے لیے کوئی دن نہ آئے، جو عدل ہے اس کی داد کا کوئی وقت نہ آئے، اس کے اندر جو برے، شریر اور نابکار ہیں ان کو کوئی سزا نہ ملے، جو نیک، حق شناس اور عدل شعار ہیں ان کو ان کی نیکیوں کی جزا نہ ملے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ سارا کارخانہ بالکل عبث، بے غایت اور باطل ہے جس کے بنانے والے کے نزدیک خیر اور شر، ظلم اور عدل، حق اور باطل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ بات انسان کی عقل وفطرت کسی طرح بھی قبول نہیں کر سکتی اس لیے کہ خالق کی خلقت کے ہر گوشے میں اس کی حکمت، قدرت، رحمت اور ربوبیت کے آثار موجود ہیں اور اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ انسان کسی طرح ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ خالق کی نسبت وہ کس طرح باور کرے کہ اس کو ہماری نیکی بدی اور ہمارے عدل وظلم سے کوئی بحث نہیں ہے۔ اگر بحث ہے اور ضرور بحث ہے اس لیے کہ یہ بحث نہ ہو تو یہ دنیا بالکل کھیل، بلکہ بالکل ظالمانہ کھیل بن کر رہ جاتی ہے، تو اس سے یہ

بات لازم آتی ہے کہ اس دنیا کے لیے ایک یوم انصاف آئے جس میں خدا کی کامل رحمت اور اس کی کامل حکمت ظاہر ہو، ہر نیکی اپنا صلہ پائے اور ہر بدی اس کی سزا پائے۔

قرآن مجید کا طرز استدلال

قرآن مجید اپنے استدلال کا آغاز خشک اور متکلمانہ انداز سے نہیں کرتا بلکہ اپنے مخاطبوں کی ذہنیت کے اعتبار سے ان پر حجت قائم کرتا ہے اور ان کی رایوں اور ان کے عقائد میں جو کجی اور غلطی ہوتی ہے اس کو ان کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے کہ یا تو وہ صحیح اور صریح حق کو قبول کریں اور اگر اس سے انکار کریں تو ہٹ دھرمی اور حمیت جاہلیت کے سوا ان کے لیے کوئی اور جائے پناہ باقی نہ رہ جائے۔ قرآن کے دلائل یا تو مخاطب کے اقرار پر مبنی ہوتے ہیں یا ایسے مستقل اصولوں پر قائم ہوتے ہیں جو مخاطب کے اقرار وانکار سے بالکل بالاتر ہوتے ہیں۔ پھر اس دوسری قسم کی دو قسمیں ہیں، یا تو ان دلائل کا ماخذ خود انسان کے خارج میں ہے یا اس کے اندر ہے۔ پہلی قسم کے دلائل کو ہم دلائل آفاق سے اور دوسری کو دلائل انفس سے تعبیر کریں گے۔ یہ سب مل ملا کر قرآنی استدلال کی تین قسمیں ہوئیں۔

پہلی قسم الزامی دلائل کی ہے۔ وہ استدلال جو مخاطب کے اقرارات واعترافات پر مبنی ہے اس کے کئی پہلو ہیں مثلاً جو قومیں کسی الٰہ کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان تمام صفتوں اور باتوں کو مانیں جن پر یہ لفظ مشتمل ہے، یا جو قومیں اللہ کی بنیادی صفتوں کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان صفتوں کو بھی مانیں جو ان صفات کے لوازم میں سے ہیں۔ نیز ان صفات سے ان کی تنزیہ کریں جو ان صفات کے منافی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ان صفتوں کے تسلیم کرنے سے آدمی پر جو ذمہ داریاں اور حقوق واجب ہوتے ہیں ان کا بھی اقرار کریں۔ نیز جو قومیں کوئی صحیفہ رکھتی ہیں یا اپنے پیچھے کوئی تاریخ رکھتی ہیں یا اپنی سوسائٹی کے اندر نیکی اور بدی کا کوئی ضابطہ رکھتی ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیادی صداقتوں سے، ان کے معروف مسلمات سے اور ان کے بدیہی منطقی نتائج سے گریز نہ کریں۔ ایسا کرنا اپنے تسلیم

کردہ مقدمہ سے فرار اور خود اپنے منہ سے اپنے آپ کو جھٹلاتا ہے۔

دوسری قسم دلائل آفاق کی ہے۔اس کے بھی مختلف پہلو ہیں۔ سب سے پہلے وہ قوانین ہیں کہ جن کا اس کائنات میں ہر آن مشاہدہ ہو رہا ہے اور جن سے ایک خدا اور اس کی تمام صفتوں کی شہادت مل رہی ہے جو قرآن نے اللہ کے لیے بیان کی ہیں۔ پھر وہ قوانین ہیں جو اس کائنات کے واقعات و حوادث اور قوموں کے عروج و زوال میں کار فرما نظر آتے ہیں اور در حقیقت انہی صفات کے مظاہر ہیں جن سے خالق کائنات متصف ہے۔

تیسری قسم دلائل انفس کی ہے۔اس کا ماخذ در حقیقت خود انسان کا اپنا نفس ہے اور اس سے ہماری مراد وہ فطری وجدان و اذعان ہے جو فاطر السموات والارض نے نفوس کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔اس کے بعض پہلو بالکل واضح ہیں اور ہم برابر ان کا احساس کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ جو غافل اور بلید انسانوں کی نگاہوں سے کبھی کبھی او جھل ہو جاتے ہیں لیکن قدرت مختلف آزمائشیں بھیج بھیج کر ان پر متنبہ کرتی رہتی ہے۔

ہمارے اس بیان سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو کہ جس طرح ہم نے قرآن کے استدلال کو علیحدہ علیحدہ قسموں میں بانٹ دیا ہے اسی طرح قرآن میں بھی ان کا بیان الگ الگ ہے بلکہ جس طرح مخاطب کے اعتبار سے قرآن کے طرز استدلال اور اس کے اساس استدلال میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اسی طرح مخاطب کے اختلاف کی ہی وجہ سے اس کے بیان کی بلاغتوں کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کہیں صرف مخاطب کے مسلمات سے حجت پیش کی گئی ہے، کہیں دلائل انفس مذکور ہوئے ہیں اور کہیں تینوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔اسی طرح اصل دعویٰ میں بھی اشتراک و انفراد ہے۔ کہیں توحید پر استدلال ہے، کہیں رسالت پر اور کہیں معاد پر، کہیں ان میں سے دو جمع کر دیے ہیں اور کہیں تینوں کا اجتماع ہے۔ان میں فرق و امتیاز کرنا ایک ناقد بصیر کا کام ہے۔